مرتبہ عزیز الرحمن صاحب مرحوم

علم مجلسی

یا

شعروں کی ڈکشنری

حصہ ہفتم

مجیبیہ حبیبیہ کتب خانہ کلاں محل۔ دہلی

قیمت 1/8

علم مجلسی

ساتواں حصہ

دلچسپ

غزلیں

مؤلفہ

عزیز الرحمان میر منشی قلعہ معلی دہلی

مطبوعہ محبوب المطابع پریس
(دہلی)
بار سوم ۱۹۵۷ء
قیمت ۸/

فہرست مضامین نظم مجلسی حصہ ہفتم

مصرعۂ غزل	صفحہ

آخری گزارش

ساقی کو دو نوید بہار آئی باغ میں
سودے نے پھر خلل سا کیا ہے دماغ میں

"تالیف و تصنیف کا شغل بھی ایک قسم کے سودے سے کم نہیں، علمِ مجلسی کے چھٹے حصے کے بعد عہد کر لیا تھا کہ اس کے بعد کوئی حصہ شائع نہ کیا جائے گا۔ مگر بہت سی نادر و نایاب غزلوں کا مجموعہ شائع ہوئے بغیر پڑا تھا۔ اُدھر عہد کا خیال، اِدھر ایسے نایاب مجموعہ کے بے مصرف پڑے رہنے کا افسوس، آخر دل سے مشورہ لیا تو حضرتِ دل نے مجبور کر دیا کہ ایسے اچھے مجموعہ کو جو کہ اتنی محنت و جانفشانی اُٹھا کر منتخب اور جمع ہو چکا ہے بیکار نہ پڑا رہنے دیا جائے بلکہ قدردانانِ سخن کی ضیافتِ طبع کے لئے ضرور شائع کر دیا جائے ؎

انھیں کیا حکم ہے ضبطِ محبت — کچھ آنسو آ گئے ہیں چشمِ تر تک

جو کچھ بھی منتخب مجموعہ تھا وہ سب اس آخری حصہ میں شائع کر دیا گیا ہے، اوّل تو امید ہے کہ ناظرین بھی اس صفت قلزم یعنی علمِ مجلسی کے ساتوں حصوں کے مطالعہ سے سیر ہو گئے ہوں گے اور دوسرے یہ کہ مؤلف کے پاس بھی جمع شدہ مصالحہ ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے اس سلسلہ علمِ مجلسی کی طرف سے سخن کے متوالوں کی خدمت میں یہ آخری سلام قبول ہو ؎

رہا نہ بادہ تو شیشہ جھکا کے ساقی نے
کہا یہ رندوں سے لیجے سلام شیشے کا

خاکسار عزیز الرحمٰن میر منشی قلعۂ معلّیٰ آل کلاں محل دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شاد

مصیبت جس سے زائل ہو وہی سامان کر دیگا
نہ گھبرانا خدا سب مشکلیں آسان کر دیگا

جگہ دل میں نہ دے اے شوقِ نمو داری بُری شے ہے
یہی جس کا تجھے برباد اے نادان کر دیگا

خوشی سے مشکلوں کا سامنا کر، منھ نہ پھیرا اے دل
ترے عقدوں کو حل، تیرا یہی اوسان کر دیگا

لگی ہے تاک جس ساغر کی۔ اک مدت سے اے میکش
اُسی ساغر سے مے ساقی تجھے پہچان کر دیگا

کوئی گر سلطنت بھی دے تو واپس کر نہ لے اے دل
سبک ہر طرح تجھ کو غیر کا احسان کر دیگا

کہے دیتا ہوں قاتل لے خبر جانبازی کی اپنے
فنا شوقِ شہادت میں کسی دن جان کر دیگا

غزل سے کیا مراد اے شاد کچھ صاحب کمالوں کی
کسی دن تصفیہ اس کا مرا دیوان کر دے گا

اکبر

اکبر نہ تھما بتخانے میں زحمت بھی ہوئی اور زر بھی گیا
کچھ نام خدا سے اُنس بھی تھا کچھ ظلم بتاں سے ڈر بھی گیا

کعبے سے بُت نکلے بھی تو کیا کعبہ ہی گیا جو دل سے نکل
افسوس کہ بُت بھی ہم سے چھٹے قبضے سے خدا کا گھر بھی گیا

پروانے کا حال اُس محفل میں ہے قابلِ رشک اے اہلِ نظر
اک شب میں یہ پیدا بھی ہوا شیدا بھی ہوا اور مر بھی گیا

جو گونج رہا تھا خوشیوں سے اُس قصر پہ کل دنیا میں بہت
کوئی متنفس تھا نہ وہاں باہر بھی گیا اندر بھی گیا

جناب ریاض

دورہی راہ سے کچھ بیٹھ گیا۔ دل میرا
پاؤں کیا خاک اُٹھے گا۔ سوئے منزل میرا

رنگ باندھا ہے چمن میں فغاں نے میری
چپکے چپکے منہ دیکھتے رہتے ہیں عنادل میرا

آستیں رنگ یہ لے آئی، لہو دے نکلی
نہ چھپا لاکھ چھپا حشر میں قاتل میرا

بزم متوالی تھی کیا خم سے اُڑائی میں نے
ہاتھ تھاما نہ کسی نے سر محفل میرا

کچھ عجب لطف سے مل جل کے رہا ایک سے ایک
غم ترا، جان مری، رنج ترا، دل میرا

یہ مرا ہو کے رہا بعد فنا تربت میں
تھا سوا جان سے بھی میرے لئے دل میرا

جو کھلا پھول بنا زخم مرے دل کا ریاض
جو کلی رہ گئی کھلنے سے۔ بنی دل میرا

شیخ فدا علی عیش

پروانوں سے سوا ہوا مجمع ہزار کا
گل گر پڑا جو قبر پہ شمع مزار کا

کیا ہو رہے ہیں پاک نہا کر گناہ گار
دریا چڑھا ہے رحمت پروردگار کا

بس اس لئے بہشت کی ہے آرزو مجھے
جنت میں ہو کے راستہ کوئے یار کا

سمجھا ہوا ہے تو جسے ساقی سیاہ ابر
اُٹھا ہے یہ غبار کسی بادہ خوار کا

تیرا فراق بھی کوئی صانع ہے اے صنم
پُتلا بنا دیا ہے۔ مجھے انتظار کا

معنی یہی ہیں دست درازی کے اے جنوں
باقی رہے نہ نام گریباں کے تار کا

مجھ پر چلے جو یار کی شمشیر آبدار
مالا پہناؤں تیغ کو زخموں کے ہار کا

معراج کیوں نہ عیش ہو اپنے کلام کا
مداح ہوں میں خسرو رفرف سوار کا

میر مہدی مجروحؔ

غیروں کو بھلا سمجھے اور ہم کو بُرا جانا | سمجھے بھی تو کیا سمجھے۔ جانا بھی تو کیا جانا
مانگوں تو سہی بوسہ۔ پر کیا ہے علاج اسکا | یاں ہونٹ کا ہل جانا۔ واں بات کا پا جانا
کچھ عرضِ تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تھا | مَیں نے تو کہا کیا تھا۔ اور آپنے کیا جانا
اک عمر کا دکھ پائے۔ سوتے ہیں فراغت سے | اے غلغلۂ محشر۔ ہم کو نہ جگا جانا

مجروحؔ ہوتے مائل کس آفتِ دوراں پر
اے حضرتِ دل، تم نے بھی دل نہ لگا جانا

جنابِ سید شاہ نظام الدین صاحب دلگیرؔ

مرنے والوں کے لئے خنجرِ بُراں کس کا | راستہ دیکھتی ہے ہمتِ مرداں کس کا
برق جب کوندتی ہی ہنس کے وہ فرماتے ہیں | وہ چلا چرخ پہ نالہ شرر افشاں کس کا
مُردے اُٹھ بیٹھے مزاروں میں قیامت آئی | قدم آیا طرفِ گورِ غریباں کس کا
اُف نہ کی ہم نے کئے ظلم ہزاروں تم نے | یہ کلیجہ ہے بتا؛ تو مری جاں کس کا
پہلوئے غیر میں آرام سے سونے والے | چاک ہے مثلِ سحر، دیکھ گریباں کس کا
دل کو برباد کرو، شوق سے میرے لیکن | سوچ لو پہلے کہ گھر ہوتا ہے ویراں کس کا
دل سا پرورده آغوش ہو جب اُن کی طرف | پھر بھلا اور بھرے سے کرے انساں کس کا
عہد یہ ہے کہ کبھی خود نہ پئیں گے زاہد | کوئی گل رنگ دے پیمانہ تو پیماں کس کا
جست کر کر کے نکل جائیں گے مستانۂ عشق | جوشِشِ وحشت جو سلامت ہے تو زنداں کس کا

عشق میں جس کے کئی ہیرے کی کھائی دلگیرؔ
یہ تو بتلاؤ کہ ہے وہ دُرِ دنداں کس کا

جناب مولوی شاہ عبدالصمد صمدؔ غازی پوری

مجھ کو گلے لگا کے یہ اُن کا سوال تھا
ہاں سچ کہو اسی لئے اتنا ملال تھا

پہلو میں دی جگہ تمہیں دلدار جانکر
تم دلربا بنو گے کہاں یہ خیال تھا

دِل کا کہیں پتہ نہ جگر کا نِشان ہے
سب چھین کر وہ لیگئے مفلس کا مال تھا

غش آ گیا تھا حضرت موسیٰ کو طور پر
جلوہ فگن وہاں بھی ترا ہی جمال تھا

کیا دن مزے کے تھے وہ کہ راتوں کو صبح تک
بس تھا تری جناب تھی دستِ سوال تھا

تم کو بھی کچھ خبر صمدؔ خستہ جاں کی ہے
دیکھا تھا رات میں نے بہت خستہ حال تھا

جناب ریاضؔ

رنگ پر کل تھا ابھی لالۂ گلشن کیسا
بے چراغ آج ہے، ہر ایک نشیمن کیسا

اب خدا جانے بہار آتی ہے اسمیں کہ نہیں
میرے دم سے کبھی آباد تھا گلشن کیسا

چھپ کے راتوں کو کہیں آپ نہ آئے نہ گئے
بے سبب نام ہوا آپ کا روشن کیسا

ذبح کے وقت بہت صاف رہا تھا یہ تو
دے اُٹھا خون، دمِ حشر یہ دامن کیسا

تو وہی جائیگی اُس گھر سے جو نکلی کوئی بات
نگہ شوق یہ دیوار میں روزن کیسا

میری سج دھج تو کوئی عشق بتاں میں دیکھے
ساتھ قشقے کے ہے زنار برہمن کیسا

آئے ہیں داغ نیا دینے وہ مجھ کو پسِ مرگ
آج پھیلا ہے اُجالا سرِ مدفن کیسا

باغباں کام ہمیں کیا ہو وہ اُجڑے کہ رہے
جب ہمیں باغ سے نکلے تو نشیمن کیسا

پارسا بن کے ریاضؔ آئے ہیں میخانہ میں
آپ بیٹھے ہیں چھپائے ہوئے دامن کیسا

حضرت امیر ابن امیر ہز ہائینس میر علی نواز خان بہادر المتخلص بہ ناز

والی ریاست خیرپور سندھ

ہمارے پینے کا آج انتظام کر لینا
ملا کے توبہ کے ٹکڑوں کو جام کر لینا

شبِ فراق میں ان سے یہ کام کر لینا
بلا کے غیروں کو، میرا بھی نام کر لینا

خیال رکھتا ہوں کا سفر میں کعبے کے
ملیں جو راہ میں جھک کر سلام کر لینا

چھپا کے زلفوں میں منھ میرے گھر چلے آؤ
تمہیں تو صبح کو آنا ہے شام کر لینا

میں کیا سناؤں تمہیں وصل و ہجر کا جھگڑا
تم آج آ کے یہ قصہ تمام کر لینا

ہمارے نالوں کا آج اور کچھ ارادہ ہے
جفائے دنیا ہوں کچھ ترک تمام کر لینا

خدا کی بندگی اے ناز کیا کرو گے تم
نہ آیا تم کو بتوں کا بھی رام کر لینا

غزل

دل ہی بجھا ہوا ہو تو لطفِ بہار کیا
ساقی ہے کیا، شراب ہے کیا۔ لالہ زار کیا

یہ دل کی تازگی ہے وہ دل کی فسردگی
اس گلشنِ جہاں کی خزاں کیا بہار کیا

دیکھا سرور بادۂ ہستی کا خاتمہ
اب دیکھیں رنگ لائے اجل کا خمار کیا

اب کے تو شامِ غم کی سیاہی کچھ اور ہے
منظور ہے تجھے مرے پروردگار کیا

دنیا سے لے چلا ہے جو حسرتوں کا بوجھ
کافی نہیں ہے سر پہ گناہوں کا بار کیا

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح
اس کے لئے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

کیسا ہوا و حرص میں برباد ہے بشر
سمجھا ہے زندگی کو یہ مشتِ غبار کیا

خلعت کفن کا ہم تو زمانے سے لے چکے
اب ہے عروسِ مرگ تجھے انتظار کیا

غزل نظیر اکبر آبادی

بتوں کی مجلس میں شب کو مہرو، جو اور ٹک بھی قیام کرتا
کنشت ویراں۔ صنم کو بیزار، برہمنوں کو غلام کرتا

خراب خستہ سمجھ کے تو نے، پیارے مجھ کو عبث نکالا
جو رہنے دیتا، تو گلرخوں میں، قسم ہے تیری میں نام کرتا

کروڑوں دل جو موئے پڑے ہیں، نکلتے خونیں کفن سے باہر
قیامت آتی، جو سرو قامت گلی میں اپنی خرام کرتا

نہ اتنے قصے نہ جنگ ہوتی، پیارے تیرے ملاپ اوپر
رقیب خود آپ زہر کھاتے۔ جو وصل کا تو پیام کرتا

وہ سرو قامت جو مسکرا کر چمن میں جاتا تو صدقے ہو کر
تڑپتی بلبل، سسکتی قمری۔ گلوں پہ ہنسنا حرام کرتا

بھلا ہوا جو نقاب تو نے اٹھایا چہرے سے ہے پہ یہ پر
وگرنہ سینے میں دل تڑپ کر نگہ میں آ کر قیام کرتا

جو زلفیں مکھڑے پہ کھول دیتا۔ صنم ہمارا تو پھر یہ گردوں
نہ دن دکھاتا۔ نہ شب بناتا۔ نہ صبح لاتا نہ شام کرتا

وہ بزم اپنی تھی میخواری کی، فرشتے ہو جاتے مست و بیخود
جو شیخ جی واں سے بچ کے آتے۔ تو پھر اُن کو سلام کرتا

کمالِ گردوں۔ اگر جہاں میں۔ جو خاک میری کو جام کرتا
تو میں صنم کے لبوں سے مل کر، عجیب عیش مدام کرتا

جو پاتا لذت بسانِ مستاں۔ مئے محبت سے تیری زاہد

تو صومعے سے نکل کے اپنے۔ وہ میکدے میں مقام کرتا

نظر تیری اشارتوں سے۔ یہ باتیں غیروں کی سن رہا ہے
وگرنہ کس میں تھی تاب و طاقت۔ جو مجھ سے آکر کلام کرتا

جناب پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی

کہوں کیا کہ قبضہ ہوا ہے کسی کا — یہ دل یا تو میرا تھا یا ہے کسی کا
نہیں دیکھ سکتے جسے ہم وہ جلوہ — نظر میں سمایا ہوا ہے کسی کا
عبث ہو دلِ زار شکوہ سرائی — کوئی بھی جہاں میں ہوا ہے کسی کا
مرا نام لکھ کر مٹانے سے حاصل — کہیں نام یوں بھی مٹا ہے کسی کا
جگر تھام کر دونوں ہاتھوں سے دیکھیں — قیامت کا اب سامنا ہے کسی کا
نہ شرماؤ آکر مرے دل میں بیٹھو — یہاں سے بھی کیا سامنا ہے کسی کا
کسی کو دیا دل ہمارا ہی دل تھا — اجارہ محبت میں کیا ہے کسی کا
مزے اس کی تصویر کے لے رہا ہوں — تصور جو دلمیں بندھا ہے کسی کا
قدم کیوں لوں بڑھ کے پیک قضا سے — کہ قاصد یہ بھیجا ہوا ہے کسی کا
ادھر ہوش اڑنے لگے آرزو کے — ادھر رخ سے پردہ اٹھا ہے کسی کا
پہنچنا نہیں اس کے کوچے میں مشکل — اگر شوقِ دل رہنما ہے کسی کا
کلیجہ کو رہ رہ کے ملتا ہے کوئی — گزر دل میں کیا پھر ہوا ہے کسی کا
مرا جسم لاغر جو دیکھا قضا نے — کہا آہ یہ نقشِ پا ہے کسی کا
سرِ رہ گذر شوخیاں کہہ رہی ہیں — یہ فتنہ ہے یا نقشِ پا ہے کسی کا

خیالِ معاصی سے گھبرا نہ شاکرؔ
قیامت کے دن آسرا ہے کسی کا

جناب ریاض

یہ کس کے سایۂ دیوار نے مجھے پیسا	یہ کون ٹوٹ پڑا مجھ پہ آسماں کی طرح
رہ حیات کٹی اس طرح کہ اٹھ اٹھ کر	میں بیٹھ بیٹھ گیا گرد کارواں کی طرح
گیا چمن میں تو جھک کر بہت ملی شاخیں	لیا گلوں نے مجھے آشیاں کی طرح
مجھے شباب نے مارا بلائے جاں ہو کر	بہار آئی مرے باغ میں خزاں کی طرح

ریاضؔ موت ہے اس شرط سے ہمیں منظور

زمیں ستائے نہ مرنے پر آسماں کی طرح

اعلیٰ حضرت میر علی نواز خاں صاحب بہادر والی خیرپور سندھ

خامشی عرض حال ہے شاید	میری صورت سوال ہے شاید
نہیں آنکھوں میں آپ کے ڈورے	یہ محبت کا جال ہے شاید
یاد آتے ہیں ہوش کھوئے ہوئے	اب طبیعت بحال ہے شاید
دل میں کچھ اور تو نہیں ہے مرے	اک تمہارا خیال ہے شاید
اپنی صورت کو کیوں چھپاتے ہو	یہ بھی چوری کا مال ہے شاید
ہجر کی سوگواریوں سے کھلا	وصل میں بھی وصال ہے شاید
دے رہی ہے جواب گویائی	کوئی پرسان حال ہے شاید
کیوں ٹپکتی ہے آنکھ سے حسرت	شیشۂ دل میں بال ہے شاید
یا نہیں دوستی کے ہم قابل	یا محبت کا کال ہے شاید

جان دینے پہ فخر کیسا نازؔ

عاشقی کچھ کمال ہے شاید

سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی جانشین جناب میر درد دہلوی

تمنا کوئی پیدا کر یا کوئی ارمان پیدا کر
کسی سے راہ تو بھی اے دلِ نادان پیدا کر

سمائی میرے ارمانوں کی شاید اب نہیں ہو سکتی
الٰہی دوسرا اک عالمِ امکان پیدا کر

یہ مانا حسن و خوبی میں نہیں کوئی ترا ثانی
مگر مجھ سا بھی عاشق کوئی میری جان پیدا کر

سنا کر خوبیاں فردوس کی حوروں کی اے زاہد
دلوں میں نوجوانوں کے نہ تو ہیجان پیدا کر

تقاضے ہو رہے ہیں یہ پے در پے مجھ پر طبیعت کے
کوئی معشوق خوش رو اور خوش الحان پیدا کر

نہیں لکھی گئی گر شادمانی میری قسمت میں
تو میری مرگ کا ہی، اے خدا سامان پیدا کر

زمانہ سرد مہری کی شکایت تجھ سے کرتا ہے
محبت اپنے دل میں تو کسی عنوان پیدا کر

برائی اور بھلائی دیکھ لی دنیا زمانے کی
شعور اب تو کسی صورت دلِ نادان پیدا کر

سمجھ میں تیری آجائے تو میں یہ رائے دیتا ہوں
کسی کا عشق تو بھی ناصحِ نادان پیدا کر

چھچھوری حرکتیں بیہودہ باتیں چھوڑ دے بالکل
زمانہ کی نگاہوں میں تو عزت و شان پیدا کر

فراق آنسو بہا کر حضرت شبیر کے غم میں
سمندر کوئی پیدا کر، کوئی طوفان پیدا کر

نواب محمد یوسف علی خاں بہادر مرحوم والی ریاست رامپور

میں نے کہا کہ دعویٰ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے
عشقِ مجاز و چشمِ حقیقت مگر غلط

بوس و کنار کے لئے یہ سب فریب ہیں
اظہارِ پاکبازی و ذوقِ نظر غلط

مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی
جانِ عزیز پیشکشِ نامہ بر غلط

پوچھو کہ کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام
کہتے ہو جان دی ہے سرِ رہگذر غلط

وہ پوچھتے پھرے کہ جنازہ کدھر گیا
مرنے کی اپنے روز اڑائی خبر غلط

آیت نہیں حدیث نہیں جس کو مانیے
ہے نظم و نثر اہلِ سخن سر بسر غلط

مالک الدولہ صولت

ہے خدائی اُس بتِ بے دین و ایماں کی طرف
کون بندہ حق کہے گا اب مسلماں کی طرف

رفتہ رفتہ دستِ وحشت کی رسائی دیکھئے
آستیں کا چاک جا پہونچا گریباں کی طرف

لوگ کہتے ہیں ضرور اک دن قیامت آئیگی
کاش آنکلو تمہیں گورِ غریباں کی طرف

ہم تو کہتے ہیں کسی سے واسطہ ہم کو نہیں
آپ تو کہئے اُٹھا کر ہاتھ قرآں کی طرف

دن ہمارے قتل کا قاتل بتاتا ہی نہیں
ابروؤں کا ہو اشارہ عیدِ قرباں کی طرف

سنتے ہیں صولت گرفتارِ بلائے زلف ہے
کیا وہی جکڑا ہوا جاتا تھا زنداں کی طرف

مالک الدولہ صولت

نہیں داغِ دل ہیں مٹانے کے قابل
یہ گلشن ہے اُن کے دکھانے کے قابل

جُدائی میں ہم منہ لپیٹے پڑے ہیں
نہ آنے کے قابل نہ جانے کے قابل

جو رمز و کنایہ لکھا خط میں اُس نے
وہ باتیں نہیں بتانے کے قابل

کہا بے وفا دل لگی میں تو بولے
کوئی ڈھونڈ لو دل لگانے کے قابل

محبت کا گیسو کی پابند ہوں میں
نہیں بیڑیاں یہ بڑھانے کے قابل

غزل مومن

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی سے کسی کو ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

مجھ سے نہ بولو تم۔ اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجئے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

اس کو نہیں جا مریں گے۔ مڑ اے ہجوم شوق
آج اور زور کرتے ہیں بیطاقتی سے ہم

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی، کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

کیا گل کھلے گا۔ دیکھئے ہے فصل گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

ہے چھیڑ اختلاط بھی غیروں کے سامنے
ہنسنے کے بدلے روئیں نہ کیوں گدگدی سے ہم

لے نام آرزو کا، تو دل سے نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

جناب حفیظ - جون پوری

بیخود ہوئے ہیں جلوۂ کون و مکاں سے ہم
بیٹھے ہیں ہاتھ اٹھا کے یونہی دو جہاں سے ہم

فرصت ملے تو پوچھ لیں عمر رواں سے ہم
جانا کہاں ہے آئے ہیں آخر کہاں سے ہم

پرساں جو ہو کبھی کوئی حال خراب کا
اے بیخودی تو کہہ نہ سکیں کچھ زباں سے ہم

وہ دل نہ وہ دماغ نہ وہ آرزو رہی
اے عمر رفتہ لائیں تجھے اب کہاں سے ہم

رہنے نہ دیگا باغ میں صیاد کا خیال
اڑ کر قفس میں جائیں گے خود آشیاں سے ہم

منظور حشر و نشر جو ہونا ہے آج ہو
گھبرا گئے ہیں روز کے اس امتحاں سے ہم

ٹکرائے سر زمیں سے ابھی آسمان کا
اپنے قدم اٹھا لیں اگر درمیاں سے ہم

اچھے اگر ہوں شعر تو کچھ داد دیں **حفیظ**
اتنا بھی کیا کہیں نہ کسی قدرداں سے ہم

حکیم آغا حسن صاحب آزل لکھنوی

طالب جام ساقیا ہیں ہم
پر چھپا کر، کہ پارسا ہیں ہم

نزع کے وقت دیکھنے آئے
جانیے آپ سے خفا ہیں ہم

کون کافر یقین کرتا ہے
لاکھ یہ بُت کہیں خدا ہیں ہم

آپ کے دل سے دل نہیں ملتا
پاس بیٹھے ہیں اور جدا ہیں ہم

قیس میں ہم میں فرق اتنا ہے
پیشوا وہ تھا رہنما ہیں ہم

آج گلشن میں کہہ رہی ہیں ہم
تیرے شاگرد اے صبا ہیں ہم

غزل جناب پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی

کسی کی جستجو ہے اور میں ہوں
تجسس چارسو ہے اور میں ہوں

ترے قربان اے میرے تصوّر
وہ گویا روبرو ہے اور میں ہوں

اسی کا نام ہے ہر دم زباں پر
اسی کی گفتگو ہے اور میں ہوں

الٰہی دردِ دل کس کو سناؤں
کہ ہر حالت میں تو ہے اور میں ہوں

تنِ تنہا ہوں اس وحشت کدہ میں
بس اک میدان ہو ہے اور میں ہوں

تماشا ہے کہ دل ہے جس کا مسکن
اسی کی جستجو ہے اور میں ہوں

تجھے ہرگز نہ جانے دونگا دل سے
خیالِ یار تو ہے اور میں ہوں

کبھی مشغلِ کتاں ہے چاک سینہ
کبھی شغلِ رفو ہے اور میں ہوں

ہوا ہے زیست سے دل شاد شاکر
اجل کی آرزو ہے اور میں ہوں

مائلؔ دہلوی

اے دلِ زار کیا کروں، آہ وہ یار اب کہاں
صبر و قرار لے گیا۔ صبر و قرار اب کہاں

وہ تو گئے ہوا ہوئے مثلِ غبار اب کہاں
ہاتھ بڑھائیے لاکھ تو، دامنِ یار اب کہاں

ڈھونڈوں کہاں شباب کو، لاؤں کہاں سے لولے
آئے بہار شوق سے۔ اپنی بہار اب کہاں

خاک سے نبھے نبے ہوئی۔ خاک میں تھے ملے ہوئے
خلدِ بریں میں آ گئے۔ لطفِ مزار اب کہاں

اب تو قفس ہے اور تو۔ لاکھ تڑپ کے جان دی
برق گری وہ آشیاں۔ بلبلِ زار اب کہاں

دشمن و دوست کوئی ہو۔ قبر پہ آئے شوق سے
ہو گئے خود غبار ہم۔ دل میں غبار اب کہاں

اس کی زباں سے پوچھ لو۔ وضع کو اس کی دیکھ لو
مائلؔ دشت گرد کا، شہر و دیار اب کہاں

غزل شاکر

آہ تیری یاد کو کم کیا کریں
دل ہی قابو میں نہیں ہم کیا کریں

آنے والے جائینگے اک دن ضرور
پھر کسی کی مرگ کا غم کیا کریں

مر رہے آپ اپنے غم میں ہم
غیر کے مرنے کا ماتم کیا کریں

پہلے غم کھایا کیے ہم رات دن
اب ہمیں کھانے لگا غم کیا کریں

ایک بھی آنسو نہ نکلا وقت پر
اعتبارِ چشمِ پُرنم کیا کریں

کیا کہیں اپنی پریشانی کو ہم
دل کی جمعیت کو برہم کیا کریں

غنچۂ اُمید کھلنے سے رہا
اشک ریزی مثلِ شبنم کیا کریں

تو ہی اے افسردگی اب ساتھ دے
قافلہ آگے گیا ہم کیا کریں

ساتھ جب شاکرؔ نہ کچھ بھی جائیگا
جمع پھر دینار و درہم کیا کریں

اکبر الٰہ آبادی

کچھ آج علاجِ دلِ بیمار تو کر لیں / اے جانِ جہاں آؤ ذرا پیار تو کر لیں

منھ ہم کو لگاتا ہی نہیں وہ بُتِ کافر / کہتا ہے یہ اللہ سے انکار تو کر لیں

سمجھے ہوئے ہیں کام نکلتا ہی جنوں سے / کچھ تجربہ سبحہ و زنار تو کر لیں

سو جان سے ہو جاؤنگا راضی میں سزا پر / پہلے وہ مجھے اپنا گنہگار تو کر لیں

حج سے ہمیں انکار نہیں حضرتِ واعظ / طوفِ حرمِ کوچہ دلدار تو کر لیں

منظور وہ کیوں کرنے لگے دعوتِ اکبر / خیر اس سے ہو کیا بحث ہم اظہار تو کر لیں

غالب

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں / خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل / انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے / لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے / آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے / لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا / وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

ولہ

نیند اسکی ہے، دماغ اسکا ہے، راتیں اسکی ہیں / جسکے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام / قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا / بلبلیں سنکر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب / یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج / مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں / دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

ابو المعانی مرزا یاس لکھنوی

رسم دنیا نہ سہی فرض ادا کرتے ہیں ہاتھ اٹھے یا نہ اٹھے دل سے دعا کرتے ہیں

موسم گل میں جو خاموش رہا کرتے ہیں وہ بھی اک سعیِ بے لفظ ادا کرتے ہیں

حضرتِ دل ہیں عجب ظالم مظلوم نما گھر جلا کر کفِ افسوس ملا کرتے ہیں

دیکھنا یہ ہے کہ سرگشتۂ سعیِ باطل کیا علاجِ دلِ دیوانہ نما کرتے ہیں

دامنِ مطلبِ نایاب کی اللہ رے ہوس دستِ شل حوصلۂ بے سروپا کرتی ہیں

عمر بیداریِ موہوم کے دھوکے میں کٹی اب جو چونکے ہیں تو خود اپنا گلہ کرتے ہیں

پاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے منزل کی طرف کان اب تک ہوسِ بانگِ درا کرتے ہیں

لذتِ مژدۂ فردا میں جو ہیں ڈوبے ہوئے طعنۂ غفلتِ امروز سنا کرتے ہیں

دیکھ کر دور سے مستقبلِ روشن کی جھلک جان نظارۂ اول میں فدا کرتے ہیں

بے اجل منزلِ فانوس پہ مرنے والے جان کیا دیتے ہیں اک رسم ادا کرتے ہیں

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

ناخدا تیرے ارادوں میں خدا برکت دے یاس اک مرتبہ پھر قصدِ دعا کرتے ہیں

غالب مرحوم

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی۔ یہ جو کہا تو دیکھیے سامنے آن بیٹھنا، اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے اسکی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز غیر سے چاہیے تہی سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ، کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار، پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

غزل انشاء

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

کہیں ہیں صبر کس کو، آہ ننگ و نام کیا شے ہے
غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

کہیں بوسہ کی مت جرأت دِلا کر بیٹھیو ان سے
ابھی اس حد کو وہ کیفی نہیں ہشیار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جسے پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

نئی یہ وضع شرمانے کی سیکھی آج ہے تم نے
ہمارے پاس صاحب ورنہ یوں سو بار بیٹھے ہیں

کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے بھلا انشاء
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

غزل

کسی کی آرزو ہے اور میں ہوں
خیال خوبرو ہے اور میں ہوں

بتوں کی جھڑکیاں سنتا ہوں اکثر
یہ میری آبرو ہے اور میں ہوں

مراد مجھ کو مل جائے تو کہہ دوں
مری جاں اب تو تو ہو اور میں ہوں

سوالِ وصل پر خنجر یہ بولا
کہ اب تیرا گلو ہے اور میں ہوں

اندھیری رات میں رکھ کر گئے سب
بس اِک اللہ تو ہے اور میں ہوں

غزل انشاء

پھبن۔ اکڑ۔ چھب۔ نگاہ۔ سج۔ دھج۔ جمال طرز خرام۔ آٹھوں
نہ ہو وہیں اُس بُت کے گر پجاری، تو کیوں ہیبلہ کا نام۔ آٹھوں

ذقن۔ زنخداں۔ لب دہان و رخ و جبین و نمک، تبسّم
سِکھائے ہیں اُس پری کو کافر بہ مِل کے سب قتل عام آٹھوں

ادا و ناز و حجاب و غمزہ، کرشمہ، شوخی، حیا، تغافل
تمہاری چنون کے آگے آگے۔ یہ کرتے ہیں اہتمام۔ آٹھوں

جھجک۔ لگاوٹ۔ چمک۔ جھمکڑا۔ ملال۔ غصّہ۔ کرم۔ رکاوٹ
کسی کی باتوں پہ کرتے ہیں باں۔ کسی کا جی لمنام۔ آٹھوں

شکیب و صبر و قرار طاقت۔ نشاط و آرام و عیش و راحت
تمہاری اُلفت میں کھو کے بیٹھا ہوں میں تو اب لاکلام آٹھوں

سریر و چتر و فشون و ملک و شکوہ و تاج و کمال و صحت
مرے سلیماں کو دے خُدایا، بہ جلد با اختتام آٹھوں

نہ پوچھو مجھ سے یہ سید انشاء کہ نام عاشق کے کیا ہیں و حشی
ذلیل و رُسوا۔ خراب خستہ۔ غریب بندہ۔ غلام آٹھوں

قطعہ

دو عالم جس جگہ بیٹھیں کھڑے ہو لے فسانہ
جب یہ جا گتے ہوں فتنہ سو سکتا نہیں

دل سے استفسار پایا یہ سنجیدہ جواب
رلیں اور عالم نہ ٹکرائیں یہ ہو سکتا نہیں

غزل مائل دہلوی

چلے گئے وہ ادائیں دکھا کے پردے میں
شرارتیں بھی ہیں شرم و حیا کے پردے میں

غضب کیا ہے کہ ارمان دل میں جو کچھ تھے
سنا دیئے انھیں سب التجا کے پردے میں

ملیں کسی سے تو بدنام ہوں زمانے میں
ابھی گئے ہیں وہ مجھ کو سنا کے پردے میں

وہ ایک ہی ہے ستمگر زمیں کے پردے پر
کئے ہیں خون ہزاروں حنا کے پردے میں

نہ مانگ زاہد ناداں ذرا سمجھ تو سہی
شکایتیں ہیں یہ کس کی دعا کے پردے میں

کسے ہے تاب کہ دیکھے یہ حسن کا عالم
سنا کرے تری باتیں بٹھا کے پردے میں

کسی کو پاس کسی کا نہیں رہا مائل
اک انقلاب ہے روز جزا کے پردے میں

غزل

نالہ کروں نہ شکوۂ صبح و مسا کروں
ظالم تو ہی بتا کہ کروں میں تو کیا کروں

مالیدۂ خزاں ہے گلستانِ دلفریب
بہلا کے تجھ کو اے دل ناداں میں کیا کروں

روز ازل سے در پئے آزار ہے طبیب
بتلائیے اس جنوں کی میں کیونکر دوا کروں

اظہار دردِ دل پہ زباں کٹتی ہے یہاں
کس سر زمیں پہ جا کے میں آہ و بکا کروں

اللہ رے تجسس حالات روز و شب
کیونکر خیال راحتِ عہدِ فنا کروں

قانون نے کہا ہے مرا تنگ قافیہ
ہے ظلم گر شکایت طبع رسا کروں

بیرسٹری میں شوق سخن خوب ہے امین
شاید اسی سے سوزش دل کی دوا کروں
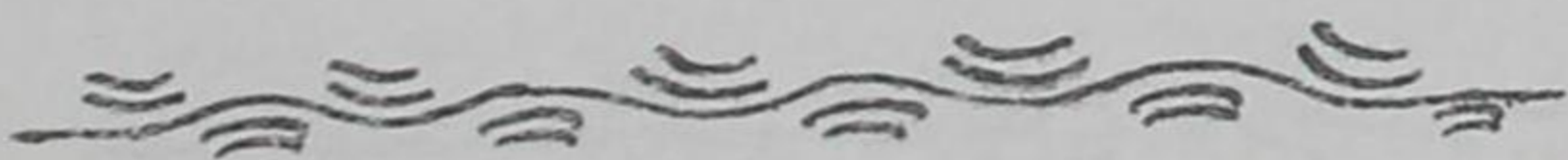
غزل جلیل

دیدۂ تر مرے خونبار ہوئے جاتے ہیں
لالہ گوں یار کے رخسار ہوئے جاتے ہیں

ہم بھی خوش ہیں کہ نہیں رشک کا موقعہ نہ رہا
ساری دنیا سے وہ بیزار ہوئے جاتے ہیں

حضرتِ دل مجھے کیا کم ہیں ستانے کیلئے
آپ کیوں درپئے آزار ہوئے جاتے ہیں

عشق کہتے ہیں کسے ہم انہیں سمجھا دینگے
وہ بھی دو روز میں ہشیار ہوئے جاتے ہیں

آپ آئیں تو سہی گورِ غریباں کی طرف
سونے والے ابھی بیدار ہوئے جاتے ہیں

لطف اٹھائیں لبِ جاناں کی مسیحائی کا
لوگ اس شوق میں بیمار ہوئے جاتے ہیں

دوڑ زاہد کہ قیامت میں قیامت آئی
داخلِ خلد گنہگار ہوئے جاتے ہیں

کان تک اُن کے جو پہنچے ہیں مرے شعر جلیل
سب کے سب گوہرِ شہوار ہوئے جاتے ہیں

غزل حسرت موہانی

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ اُلفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

سکونِ خاطرِ ناکام کی تکلیف کیا کہیے
جنون و وحشت و فصاد و نشتر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

خیالِ یار کا دل سے خفا ہونا قیامت ہے
کسی کے عشوہ ہائے ناز پرور یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد انکی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

غزل مرزا بسمل اللہ بیگ صاحب بسمل دہلوی

سو آفتوں سے امن ہو اُن کے حجاب میں
سو فتنے ہیں بندھے ہوئے بندِ نقاب میں

پُرزے اُڑا کے خط کے یہ اک پُرزہ لکھدیا
لو اپنے ایک خط کے یہ سو خط جواب میں

آئیں کہاں وہ خانہ خرابوں کے گھر کہاں
یا خواب تک نہیں کہ کبھی آئیں خواب میں

دُنیا میں تیرا دل ہو فزوں اضطراب میں
شعلے سے ہو زیادہ دہواں پیچ وتاب میں

دُنیا ہو ایک خواب اور اس میں یہ زندگی
گویا کہ خواب دیکھ رہے ہم ہیں خواب میں

گر چشم ہوش کھول کے دیکھو تو غافلو
عبرت کا موجزن ہے سمندر حباب میں

زاہد ملے گی مزد نہ محنت کئے بغیر
یہ سوئے ظن ہے اس کی کریمی کے باب میں

تکیہ جو عفو پر تھا وہ طاعت پہ آرہا
اُلٹا ثواب کر کے پڑا میں عذاب میں

بد اگر ہیں سو سے تو بہتر ہزار سے
ہے لاکھ لاکھ شکر خدا کی جناب میں

دفتر کے دفتر اُن کو لکھے اضطراب میں
دو حرف تک نہ لکھے اُنھوں نے جواب میں

ہے وصل میں بھی ہجر کا دھڑکا لگا ہوا
ہوں آپ اپنی فہم رسا سے عذاب میں

توبہ تو ہم بھی کر لیں ابھی شیخ جی مگر
نبھتی ہمیں نظر نہیں آتی شباب میں

کرتے ہیں شکوہ ضعف کا پیری میں ہم عبث
مارے تھے تیر ایسے ہی ہم نے شباب میں

پیری میں توبہ کر کے وہاں کے اُڑاو عیش
یاں کے تو عیش اُڑا چکے بسملؔ شباب میں

میر تقی میر

نازکی اُس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے

بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

جناب خان بہادر سید علی صاحب شاد عظیم آبادی

بتانِ ماہرو جس دم نئی بیداد کرتے ہیں
خدا بخشے جوانی کو ہم اپنی یاد کرتے ہیں

ضعیفی کو دعائیں دے دلا خوش ہو بڑھاپے سے
کہ مالک سب سگانِ پیر کو آزاد کرتے ہیں

تماشا ہو کہ دکھ دینے کا بھی الزام ہو مجھ پر
مزا یہ ہے کہ ہر دکھ میں مجھی کو یاد کرتے ہیں

لٹاتے ہیں متاعِ آرزو تیری گلی میں ہم
کمائی عمر بھر کی کیا کریں برباد کرتے ہیں

ترے کشتے نے پہنا ہو نیا خلعت شہادت کا
فرشتے عرش پر شور مبارکباد کرتے ہیں

کتابِ عمر ہے پیشِ نظر چشمِ تصور میں
اُلٹتے ہیں ورق بھولے سبق کو یاد کرتے ہیں

بنا کس روسیہ کو شوقِ مے نوشی ہوائے زاہد
دلِ محزوں کو دم بھر میکدہ میں شاد کرتے ہیں

درازی عمر کی حد سے سوا جس دم ستاتی ہو
یہ حسرت ہے تجھے اے موت گھڑیوں یاد کرتے ہیں

پنہاتے ہیں لباس فارسی اردو کے قالب پر
غزل کہتے ہیں ہم یہ طرز نو ایجاد کرتے ہیں

مصیبت ہجر کی کاٹے نہیں کٹتی قیامت ہے
اکیلے گھر میں بیٹھے نالہ و فریاد کرتے ہیں

بہت دن ہو گئے رہتے ہوئے اب جی نہیں لگتا
ارادہ اِس سرا سے کوچ کا اے شاد کرتے ہیں

غزل شاد

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

نہیں اُٹھتے قدم اب جانبِ دیر
کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں

ستایا پھر رُلا کے آرزو نے
جو دم بھر آپ میں پایا گیا ہوں

نہ تھا میں معتقد اعجازِ مے کا
بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں آپ آیا نہیں لایا گیا ہوں

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

کجا میں اور کجا اے شاد دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

جناب شمس سید امداد امام صاحب اثر عظیم آبادی

کوئی روگ ہو تو مداوا کریں
مرض ہجر کا ہے اسے کیا کریں

بحسرت کریں سوئے دشمن نظر
انھیں ساری محفل میں سُوا کریں

یہ دل چاہتا ہے کہ اے مہ جبیں
ترے روئے روشن کو دیکھا کریں

نہیں خوبرویوں کا کچھ اعتبار
عبث ہے جو تجھ پر بھروسہ کریں

شکایت فقیروں کو زیبا نہیں
ہم ایسوں کی کیونکر وہ پروا کریں

عجب کیا کہ قامت سے محشر کے دن
قیامت، قیامت ہیں برپا کریں

ہوس عیش کی دل پہ موقوف ہے
جو دل ہی نہیں کیا تمنا کریں

اثر ضبطِ گریہ کو کہتے ہیں آپ
مگر دل کی تکلیف کو کیا کریں

ہز ایکسیلنسی یمین السلطنت مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شاد جی سی آئی ای

کیوں عمر صرفِ عشقِ بتِ خوبرو کریں
دنیا میں آئے ہیں، کہ تری جستجو کریں

ہیں پاکبازِ عشق ادا جب کریں نماز
پہلے ہم اپنے خونِ جگر سے وضو کریں

ہے دید میں جو لطف نہیں اس نماز میں
ہو وہ نماز، دید تری دو بدو کریں

اے بخیہ سازِ زخمِ جگر تیرے ہاتھ سے
فرصت نہیں جو جیب گریباں رفو کریں

سنبل جھکائے شرم سے سر اپنا کھا کے بل
کاکل کا اُن کے وصف جو ہم موبمو کریں

اپنے سوا نہ دیکھیں کبھی شکل غیر کی
آئینہ دل کا اُن کے جو ہم روبرو کریں

ملتا ہے سننے والوں کو ذکرِ جلی کا لطف
محفل میں اُس کے مست اگر ہائے ہو کریں

منظور ہے جو شاد بنیں آپ مستِ عشق
پیرِ مغاں سے بیعت دستِ سبو کریں

غزل نواب سید محمد علی حسن طاہر لکھنوی

مجھ سے آنکھیں لڑائے جاتے ہیں
سوتے فتنے جگائے جاتے ہیں

تیکھی چتون دکھائے جاتے ہیں
دل پہ بجلی گرائے جاتے ہیں

پی گیا اُن کے ذکر مے زاہد
ابھی حضرت سدھائے جاتے ہیں

ڈال دو ہاتھ میری گردن میں
اس طرح دل ملائے جاتے ہیں

تمکنت کے تمہاری کچھ انداز
میری حسرت میں پائے جاتے ہیں

چھوڑے جاتے ہیں دل تمہارے پاس
رنگ صحبت جمائے جاتے ہیں

میں کروں ترک عشق اے ناصح
ایسے بگڑے بنائے جاتے ہیں

کیا غضب ہو نئی نویلی عمر
خود بخود وہ لجائے جاتے ہیں

گرمیٔ مے نے اور پھونک دیا
گل سے رخ تمتمائے جاتے ہیں

دیکھنا اُن کی وصل میں شوخی
پائوں سے گدگدائے جاتے ہیں

دیں گے طاہر تمہیں مبارکباد
ٹھیرو وہ دن بھی آئے جاتے ہیں

جناب افسوس

شہرے ترے عام ہو رہے ہیں
مرجانے کے کام ہو رہے ہیں

درباں کی خوشامدیں ہیں منظور
جھک جھک کے سلام ہو رہے ہیں

ہل جاؤ کہ نزع کا ہے عالم
سب قصے تمام ہو رہے ہیں

وہ غیر سے کر رہے ہیں باتیں
ہم ہیں کہ تمام ہو رہے ہیں

ہے رشک عدو سے زندگی ضیق
سب عیش حرام ہو رہے ہیں

مرنا تو ہمارا ہے یقینی
جینے میں کلام ہو رہے ہیں

آئے شب وعدہ اور افسوس
رخصت سر شام ہو رہے ہیں

غزل مالک الدولہ صولت

(۱)

نظر آتا ہے مجھ کو جان کا خطرہ اقامت میں
مثالِ نبض میں سرگرم ہوں قطعِ مسافت میں

جدائی میں تری میں سوکھ کر کانٹا ہوا اے گل
عجب کیا؟ ہوں جو دامن گیر صحرائے قیامت میں

گذاریں عالم خوف و رجا میں کیوں نہ تر دامن
یقیں برقِ غضب کا بھی ہے دل کو، ابرِ رحمت میں

(۲)

غمِ ہجراں سے آرام نہیں، مجھے اصلاً تابِ کلام نہیں
اس قصے کا انجام نہیں، یہ فسانہ وہ کہ تمام نہیں

تری یاد میں جب سے فقیر ہوا۔ ترے عشق میں جب سے جوگ لیا
رہا دشت میں منھ پہ بھبھوت ملا، مجھے دیر و حرم سے کام نہیں

ہیں نزع کے طور نکلتا ہے دم۔ اب الٹی سانسیں لیتے ہیں ہم
ہٹ جاؤ ہمارے سر کی قسم۔ اس وقت تمہارا کام نہیں

سرِ قبر وہ آئے جو بال کھلے۔ پڑھا فاتحہ رو کے یہ کہنے لگے
اٹھو، بیٹھو ہیں کب سے ہم آئے ہوئے۔ سو نیکا تو یہ ہنگام نہیں

غزل

اے جنونِ ہنگامِ وحشت بادیہ پیمانہ ہو
تنگیِ دل میں تڑپ منت کشِ صحرا نہ ہو

بے قراری سے تری دنیا نہ و بالا نہ ہو
ضبط قلب مضطرب محشر کہیں برپا نہ ہو

تا قیامت تیر الفت کی خلش باقی رہے
یا الٰہی حشر تک زخم جگر اچھا نہ ہو

وہ محبت کا جو ترحم اور بتِ ناآشنا
جس کا دنیا میں کوئی تیرے سوا اپنا نہ ہو

غزل عزیز

کوئی عالم میں باوفا ہی نہیں — اب کوئی ہم کو پوچھتا ہی نہیں

کہہ کے بیت الصنم سے ہم پلٹے — کیا ہمارا کوئی خدا ہی نہیں

دیدنی ہے مرا تغیّر بھی — کوئی عالم میں آشنا ہی نہیں

تم سے کہتا ہوں دردِ دل اپنا — کچھ سنا تم نے یا سنا ہی نہیں

کہہ کے یہ مر گیا مریضِ غم — اس مرض کی کوئی دوا ہی نہیں

دل نہیں جب تو کیا جبینِ خاک — میری کشتی کا ناخدا ہی نہیں

اے مرا حال پوچھنے والے — زیست کا کوئی آسرا ہی نہیں

چشمِ تر دل میں جس سے طوفاں تھا — وہ تو قطرہ ابھی بہا ہی نہیں

آہ کرتے ہیں کہہ دو گردوں سے — ہم نہیں یا یہ فتنہ زا ہی نہیں

جائیں قبروں پہ دوستوں کی کیا — واں کوئی ہم سے بولتا ہی نہیں

لاکھ دنیا نے کھائے ہیں چکّر — اپنے مرکز سے ہیں ہٹا ہی نہیں

واہ کیا زندگی ہماری تھی — رہ کے دنیا میں کچھ کیا ہی نہیں

اے شبِ ہجر کس سے حال کہوں — کوئی اس وقت جاگتا ہی نہیں

کیا اٹھیں ہم عزیزؔ مقتل سے
فیصلہ تو ابھی ہوا ہی نہیں

رُباعی

برسوں کا چھوڑتی ہی دم بھر میں ساتھ ظالم — کہتے ہیں جس کو دنیا معشوق بے وفا ہے

اہلِ عدم نہ پوچھو کچھ ہم سے حالِ دنیا — رہ آئے ہم بھی دو دن اک میہماں سرا ہے

غزل مومنؔ

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر، وہ کرم کہ تھا میرے حال پر
مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو، تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی، کہ تمہارے جی کو بُری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی۔ کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سُنو ذکر ہے کئی سال کا۔ کہ کیا اِک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا۔ وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کہ ہر آں صدا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا۔ جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مُبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

غزل شاد

اپنی ہستی کو دردِ سر و مصیبت سمجھو — موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو

فیصلہ ہوتا ہے نیکی و بدی کا ہر دم — دل کو اس جسم میں چھوٹی عدالت سمجھو

سرِ گلزار سے ادراک بڑھاؤ اپنا — گل و بلبل کو گلستاں کی حکایت سمجھو

فیصلہ آج تلک خنجر و سر کا نہ ہوا — سخت جانی مری یا اُنکی نزاکت سمجھو

ہمدمو کام فقط تمکو ہے سمجھانے سے — غم کو غم اور نہ مصیبت کو مصیبت سمجھو

تکیۂ وعدہ پہ ہے سب چپکے پڑے ہیں نہ خاک — حشر کا دن جو نہ آیا تو قیامت سمجھو

رکھ کے خنجر کو گلے پر وہ اُٹھائیں سو بار — اس کا غم کیا ہے تم اس کو بھی مروت سمجھو

کاہلی خود غرضی دل میں یہ سودا کہ دِرم — شاد اُنہیں باتوں کو اب شانِ ریاست سمجھو

غزل ریاض

ہائے رے دیوانگی کوسا کیا تاثیر کو — ہیں فغاں اپنی ہی سمجھا نالۂ زنجیر کو

دل کو ہونے دے ہدف ممکن نہیں نکلی تڑپ — یہ اُڑاتی ہے ہمیشہ چٹکیوں میں تیر کو

مٹ چکی اُن کی اداسی۔ آچکی اُن کو ہنسی — میرے گھر آئے ہیں رونے غیر کی تقدیر کو

عرش سے آئی کبھی تو آ کے اُلٹی پھر گئی — دور سے میرا سلام، اس آہ کی تاثیر کو

کس مزے سے ہم نے کاٹی آج کی فرقت کی رات — پیار کرتے رہ گئے اک چاند سی تصویر کو

منہ کھلے خم کا نہ واعظ قلقلِ مینا کے بعد — میکدہ میں طول اتنا تو نہ دے تقریر کو

کیوں ہوا ناوک خطا ہے شرم سے نیچی نگاہ — لاؤ ہم رکھ لیں کلیجے میں تمہارے تیر کو

شیخ کی دیکھی بزرگی آپ فرماتے تھے کل — ہم نے دیکھا ہے جواں اس آسمانِ پیر کو

یادگار اس وقت ہم بھی ہیں زمانہ میں ریاضؔ — مانتے ہیں سب ہمیں۔ ہم مانتے ہیں میر کو

غزل جرأت

اے دلا ہم ہوئے پابندِ غمِ یار کہ تو
اب اذیت میں بھلا ہم ہیں گرفتار کہ تو

ہم تو کہتے تھے نہ عاشق ہو اب اِتنا تو بتاؤ
جا کے ہم رٹتے ہیں پھر دل پسِ دیوار کہ تو

ہاتھ کیوں عشقِ بتاں سے نہ اُٹھایا تو نے
کفِ افسوس اب ہم ملتے ہیں ہر بار کہ تو

وہی محفل ہے وہی لوگ وہی ہے چرچا
اب بھلا بیٹھے ہیں ہم شکلِ گنہ گار کہ تو

ہم تو کہتے تھے کہ لب سے نہ لگا ساغرِ عشق
مئے اندوہ سے اب ہم ہوئے سرشار کہ تو

بے جگہ جی کا پھنسانا تجھے کیا تھا درکار
طعن و تشنیع کے اب ہم ہیں سزاوار کہ تو

وحشتِ عشق بُری ہوتی ہے دیکھا ناداں
ہم چلے دشت کو اب چھوڑ کے گھر بار کہ تو

آتشِ عشق کو سینہ میں عبث بھڑکایا
اب بھلا کھینچوں ہوں میں آہِ شرربار کہ تو

ہم تو کہتے تھے نہ ہمراہ کسی کے لگ چل
اب بھلا ہم ہوئے رُسوا سرِ بازار کہ تو

غور کیجئے تو یہ مشکل ہے زمیں اے جرأت
دیکھ ہم اس میں کہیں اور بھی اشعار کہ تو

پردہ داری (اکبر الہ آبادی)

شوخیاں پردے میں ہوں ناز و ادا پردے میں ہوں
ہر جفا پردے میں، اظہارِ وفا پردے میں ہو

نغمہ ہائے حسن کی دلکش صدا پردے میں ہو
صدمہ ہائے عشق کا بھی تذکرہ پردے میں ہو

غنچہ پردہ پوش ہو ابرگِ حنا ہو پردہ دار
بوئے گل پردے میں ہو رنگِ حنا پردے میں ہو

ابتدائے عشق میں فریاد کا موقع نہیں
بیقراری ہو تو آہِ نارسا پردے میں ہو

دشتِ وحشت میں کوئی شوریدہ سر آوارہ ہو
کوئی پابندِ حنا ناآشنا پردے میں ہو

منزلِ مقصود کو کیا پائیں ہم گم گشتہ راہ
رہبری کیا خاک ہو جب رہنما پردے میں ہو

غزل ضامن

بیا بیا اے پری پیکر، چھپا نہ مکھڑا دکھا کے ہم کو
بجان و دل من اُمید وصلت ۔ لگا کے چھتیاں بلا کے ہم کو

ز تیغ عشقش شہید گشتم ، نہ تاب ہجراں قسم خدا کی
خراب وحشی بنا دے ساقی ۔ شراب وحدت پلا کے ہم کو

ز سرو آزاد نازنینی، تمہارے قد کا ہوا ہوں سایہ
بزیر پایت ہوں افتادہ ۔ گراں نہ چنداں اُٹھا کے ہم کو

چو عشق آمد درونِ جانم ، تو شور برپا ہوا قیامت
جگایا تو نے جنونِ وحشت ۔ مزار میں بھی سُلا کے ہم کو

بچشم میگوں تو نیم خفتہ ۔ ہم آب حیات اور ستم
حیات بخشد ۔ ہلاک سازد ۔ سلایا پھر بھی جگا کے ہم کو

تو باغباں ایں جہانِ گلشن ۔ عجیب رنگت کے گل بنائے
مرا چو شبنم نمود گریاں ، رُلایا کیوں پھر ہنسا کے ہم کو

زہے ستمگر ۔ عجیب گل رو ، پری کے مانند شعلہ رو
گیا وہ محفل میں چھوڑ تنہا ، مثالِ شمع جلا کے ہم کو

کجا صراحی ۔ کدام میکش ۔ ہوئی ہے وحشت بہ محتسب کو
ہم آپ ہی بیٹھے ہیں غم کے مارے نہ چھیڑ بندے خدا کے ہم کو

غریب مسکیں ۔ فقیر ضامن ۔ گیا ہوں دامن تمہارے دمابر
کر رشک جنت ۔ حریم کوئین ۔ اُٹھا نہ یاں سے بٹھا کے ہم کو

غزل جلالؔ

صورت وصل نکلتی، کسی تدبیر کے ساتھ
میری تصویر ہی کھنچتی۔ تری تصویر کے ساتھ

نہ مٹے ڈھونڈھ کے شب کو کسی تدبیر کے ساتھ
وہ بھی بگڑے رہے بگڑی ہوئی تقدیر کے ساتھ

ہو گیا جلد اگر وصل تو کیا لطف اس میں
کیجئے وعدہ مگر تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ

منھ کو آتا ہے جگر جیسے فغاں کے ہمراہ
دم بھی کھنچ آئے یوں ہی نالۂ شبگیر کے ساتھ

ان حسینوں کو زمانہ کبھی سیدھا کر دے
نکلیں ابرو کے بھی بل زلف گرہ گیر کے ساتھ

مجرم عشق ہے تعزیر کا خواہاں تم سے
کبھی تقصیر سے پہلے۔ کبھی تقصیر کے ساتھ

اے تصور ترا احسان ترے جذب کا بھی
کھینچ لا صاحب تصویر کو تصویر کے ساتھ

اُن کا وعدہ کہ تسلی مجھے دینا ہے جلالؔ
وعدہ ہم لوگ وفا کرتے ہیں تاخیر کے ساتھ

غزل جناب بیخودؔ دہلوی

کوئی چل جاتا ہے جب تیر نظر تیر کے ساتھ
خود تڑپ جاتا ہے صیاد بھی نخچیر کے ساتھ

میری صورت سے نہ تھے عشق کے ظاہر آثار
کھچ گئی آہ بھی شاید مری تصویر کے ساتھ

کبھی قسمت کی شکایت کبھی رونا دل کا
رات بھر رہتی ہیں باتیں تری تصویر کے ساتھ

جس میں کوشش ہو سوا کام بگڑتا ہے وہی
دشمنی ہے مری تقدیر کو تدبیر کے ساتھ

میں مسلمان ہوں اس کا بھی ذرا دھیان رہے
میری گردن پہ چھری پھیرئیے تکبیر کے ساتھ

آہ مظلوم میں تاثیر نہ ہو کیا معنے
آسماں کو بھی ہے گردش مری تقدیر کے ساتھ

صبر کیجئے ابھی بیخود نہیں پچھتائیے گا
عشق میں کام بنا کرتے ہیں تدبیر کے ساتھ

غزل غالبؔ

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دِن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منھ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

غزل جناب نادر علی خانصاحب نادرؔ کاکوروی

بڑھا دو وعدۂ فردا پہ تم اتنی عبارت بھی
کہ فردا کیا نہ بھولو نگا ہیں فردائے قیامت بھی

تسلّی اِس دلِ بیتاب کی ہیں آپ ہی کر لوں
ہجومِ یاس سے پاؤں کہیں کمبخت فرصت بھی

بہم اک مختصر سے دل میں ہیں شادی و غم دونوں
یہ چھوٹا سا مکاں اور اسمیں دوزخ بھی ہے جنت بھی

سوالِ بوسہ پر بولے کہ دیکھو تم نے پھر چھیڑا
تمہیں کچھ ہوگئی ہے گالیاں سننے کی عادت بھی

یہاں زاہد بنے ہیں اور میخانہ سے کل شب کو
نکالے جائینگے میکش تو اُن میں خود بدولت بھی

نمازِ پنجگانہ سے ہے بہتر کام کیا زاہد
مگر نیت سے پہلے ٹھیک کرلے اپنی نیت بھی

شبِ غم نیند ہی اول تو کیوں آنے لگی مجھ کو
اگر سویا تو اُٹھنے کا نہیں صبحِ قیامت بھی

نری باتیں بھی نادرؔ کتنی لچھے دار باتیں ہیں
کچھ اظہارِ اطاعت بھی کچھ اندازِ متانت بھی

غزل حالی

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے
تم کو عادت ہے خود نمائی کی

ملتے غیروں سے ہو ملو لیکن
ہم سے باتیں کرو صفائی کی

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں
رہ گئی شرم پارسائی کی

موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے
ساعت آ پہنچی اس جدائی کی

زندہ پھرنے کی ہوس حالی
انتہا ہے یہ بے حیائی کی

غزل ریاض خیرآبادی

مریض ہوش میں آ رہے نہ آئے تو آئے
جو تو نہ آئے ترے گیسوؤں کی بو آئے

دبی زبان سے میرا بھی ذکر کر لینا
کلیم! طور پہ اُن سے جو گفتگو آئے

نماز ہو گی ادا دخترِ رز کے دامن پر
ہماری بزم میں جو آئے باوضو آئے

طلب کئے اگر ہم نے کبھی پیس تو یہ
بہت بھرے ہوئے ہم سے خم و سبو آئے

نثار وصل کی راتیں اس ایک ساعت پر
ہم انتظار میں تیرے ہوں اور تو آئے

دلائے یاد جو وعدے تو بولے جھنجلا کر
یہ اور حشر میں لینے کو آبرو آئے

کبھی کی پی ہوئی کام آئی آج حشر کے دن
خدا کے سامنے مے نوش سرخرو آئے

ریاض تھی جو مقدر میں بازگشتِ شباب
جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے

غزل جلیل

اظہارِ حال پر مجھے قدرت نہیں رہی
ان کو یہ وہم ہو کہ محبت نہیں رہی

درمان طلب ہوں تا نہ مسیحا ہو بےخبر
کچھ یہ نہیں کہ درد کی لذت نہیں رہی

لیلےٰ جو آکے آنکھ ملائے تو کیا ہے دور
اب آہوؤں کو قیس سے وحشت نہیں رہی

مرنے پہ بھی نہ بند ہوئی چشم منتظر
اب انتظار کی کوئی مدت نہیں رہی

کیا خاک چاہ پیار کی باتیں کریں جلیل
وہ دل نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی

غزل جناب عبدالغفار صاحب مفتوں دہلوی

تڑپنے کا دلِ مضطر کبھی عقدہ کھلے گا بھی
ارے نادان مچلتا کیوں ہے آخر کچھ کہیگا بھی

عدو نے بھی بڑھایا تو ہے تم سے ربط ضبط اپنا
مگر میری طرح یہ میل جول اس سے نبھیگا بھی

ہوا ہے شمع پر پروانے کے جلنے سے یہ روشن
کسی کو جو جلائے تو بیشک وہ جلے گا بھی

تری محفل میں اے واعظ کسی سے کیا ہنسیں بولیں
جہاں دلبستگی ہوگی وہیں کچھ دل کھلے گا بھی

سمجھ کر راہ میں سب اونچ نیچ انساں قدم رکھے
چلیگا دوڑ کر جو بے تحاشا وہ گرے گا بھی

جو تم نے ظلم سیکھے ہیں مجھی پر آزماؤ گے
مجھی پر ختم سب ہونگے کوئی باقی رہے گا بھی

یونہی کب تک رہیگا زور دورہ دردِ فرقت کا
الٰہی یہ کسی کروٹ کسی پہلو تھمے گا بھی

مرا دل ہو تمہارا تو نہیں مرتا ہے مرنے دو
نہیں کیا مرنے جینے سے مریگا بھی جیے گا بھی

عبث کرتے ہیں فکرِ رزق وہ رزاقِ مطلق ہے
کیا ہے اس نے وعدہ تو دلائے گا بھی دیگا بھی

ہماری سی زباں میں اس زمیں میں ہو غزل کس سے
وہ اپنا ہی سی اے مفتوں کہیگا جو کہے گا بھی

جناب حسن مرتضیٰ صاحب شفق عماد پوری

ہوتے ہوتے کم، بس اتنی رسم اُلفت رہ گئی
اُن سے ہم سے دُور کی صاحب سلامت رہ گئی

آرزوئیں مٹ گئیں. دل مٹ گیا، ہم مٹ گئے
مرمٹوں کی یادگار اک اس کی حسرت رہ گئی

صورتِ آئینہ گو مجھ سے ملے وہ ہو کے صاف
اس صفائی پر بھی دل میں کچھ کدورت رہ گئی

شیشۂ مے گر کے ٹوٹا خیر گذری محتسب
تھی بہت نازک تری توبہ سلامت رہ گئی

بیکسوں کی قبر پر آنسو بہانے کے لئے
اور تو کوئی نہیں اک شمع تربت رہ گئی

پہنچے مر مر کر لحد تک پہلی منزل طے ہوئی
عرصۂ محشر کی اب باقی مسافت رہ گئی

صورتِ برگِ حنا پیسا شفق کا دل تو کیا
دیکھ ہاتھوں میں ترے اے شوخ رنگت رہ گئی

غزل ریاض

مہندی ملکر مرے گھر آئے ہیں بن آئی ہے
یہ حنا جا کے اُنہیں ساتھ لگا لائی ہے

سنکے نالے مرے منہ پھیر کے ہنسنا اُن کا
بن کے کہنا کوئی دیوانہ ہے سودائی ہے

کیوں نہ ٹوٹے مری توبہ جو کہے تو ساقی
پی لے. پی لے. اے گھنگور گھٹا چھائی ہے

میں کہوں حشر ہے یہ حشر وفا ہوں وعدے
وہ کہیں ہائے یہ کیسی مری رسوائی ہے

مری آغوش میں یونہی کبھی آجا تو بھی
جس ادا سے تری آنکھوں میں حیا آئی ہے

لے گیا لوٹ کے کیا طور کی رونق کوئی
نہ وہ جلوے ہیں نہ اب کوئی تماشائی ہے

نیچی ہوگی نہ تری آنکھ بپا حشر ہوں لاکھ
نہ یہ شرمائیگی ظالم نہ یہ شرمائی ہے

چھیڑ ساقی کی ہے دینا جو نہیں جام ریاض
توبہ کی ہے نہ کبھی ہم نے قسم کھائی ہے

غزل شیخ فدا علی عیشؔ

صبح کس شب کی جلوہ گر نہ ہوئی | پر شب غم تری سحر نہ ہوئی
چشمِ رحمت ہوئی رقیبوں پر | نگہِ التفات ادھر نہ ہوئی
ایسے بندے بھی خدائی میں | مر گئے ہم اُنھیں خبر نہ ہوئی
عمر کٹنے کو کٹ گئی لیکن | چین سے ایک دن بسر نہ ہوئی

عیشؔ یوں جان دی محبت میں
میری حسرت کو بھی خبر نہ ہوئی

غزل ضامن علی صاحب ضامنؔ

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے | جو تھا رازِ پنہاں عیاں ہو بہو ہے
ہوئے جب سے عاشق ہم اپنے عزیزو | طلب ہم کو اپنی ہے اور جستجو ہے
بجز حق نہیں ہے کوئی جسم و جاں میں | صدائے انا الحق کی یوں گفتگو ہے
کبھی بن کے مجنوں وہ بن کو سدھارا | کہیں چاک داماں کا کرتا رفو ہے
کہیں متقی ہو کے مسجد میں بیٹھا | کہیں خونِ عاشق سے کرتا وضو ہے
کہیں رند مشرب کہیں ہے وہ صوفی | نہیں اُس سے خالی کوئی رنگ و بو ہے
ہزاروں ہوئے مست پی کر کے ساغر | ہمارے کی مے وہی پر سبو ہے
شہیدِ ازل اس کے خنجر کا ہوں میں | بہا جس کے کوچے میں اپنا لہو ہے
نزول اس کی رحمت ہے ہم پر ہمیشہ | جو کہتا وہ خود آپ لاتقنطو ہے
لگے آگ جل جائے میخانہ اور مے | جو ساقی نہیں اور نہیں پُر سبو ہے
سوا تیرے ضامنؔ نہ دیکھے کسی کو | یہی ہے تمنا یہی آرزو ہے

غزل حضرت ریاض خیرآبادی

چھیڑ نے ہی سر مرے زُلف رسا ہو جائیگی
یہ بری تیرے لئے او دل بلا ہو جائیگی

اے اسیران قفس آنیکو ہے فصلِ خزاں
چار دن ہیں اور گلشن کی ہوا ہو جائیگی

ساتھ اشکوں کے لہو کیا لختِ دل آئینگے
کچھ نہ کچھ بدنام اب میری وفا ہو جائیگی

موج طوفاں پھینک دیگی اس کو ساحل کیطرف
پار اب کشتی مری اے ناخدا ہو جائے گی

لے نہیں سکتا ہوں میں بھولے سے بھی کعبہ کا نام
کیا خدائی ان بتوں کی اے خدا ہو جائیگی

لا بھی دے سوڈے کی بوتل جا کے اے شیخ حرم
آب زمزم کیا ملاؤں بدمزا ہو جائے گی

لوٹ لو اچھی طرح لطفِ معاصی اے ریاض
ہیں یہی آثار اب دُنیا فنا ہو جائے گی

غزل چودہری رحم علی صاحب ہاشمی

قصہ جنونِ غم کا کہا اور رو لیئے
اِک بیوفا کو یاد کیا اور رو لیئے

اللہ ری کوششِ غم بیکاری جنوں
دردِ اپنا اپنے دل سے کہا اور رو لیئے

احباب نے کبھی جو ہنسانے کی سعی کی
ہاتھوں سے سر کو پیٹ لیا اور رو لیئے

خلوت میں دل کا شغل نہ پوچھو کہ کیا رہا
اکثر کسی کو یاد کیا اور رو لیئے

نقاشی خیال کی اللہ ری کاہشیں
جلوہ کسی کا دیکھ لیا اور رو لیئے

جب دل کی حسرتوں میں تلاطم ہوا بہت
سینہ کو اپنے چاک کیا اور رو لیئے

اتنی ہی ہم کو دردِ محبت کی ہے خبر
شعلہ سا ایک دل میں اٹھا اور رو لیئے

بیکاریوں میں شغل یہی ہاشمی رہا
رونے سے جب جنون بڑھا اور رو لیئے

غزلیاتِ صولتؔ

خبر گذری آپ کا آنا غنیمت ہو گیا — تھم گئے نالے قیامت ہو کے برپا رہ گئی
پھینک کر تیر نظر دو چار وہ ایسی ہوا — زخم ولمیں رہ گئے زخموں میں ایذا رہ گئی
کھا کے غوطے پھر نہ اُبھرا میں غریقِ بحرِ عشق — ہاتھ ساحل سے بڑھا کر موجِ دریا رہ گئی

اپنے بیگانوں سے اے صولتؔ چھٹے ہم بعدِ مرگ
سب ہوئے رخصت لحد میں لاش تنہا رہ گئی

ولہ

فراغِ قلبِ مجنوں ہے خیالِ روئے روشن بھی — وگرنہ ہے مقامِ ہُو جو وادی ایمن بھی
یہ بیدردی کے معنی ہیں ستمگر ہو تو ہو تم سا — نہ پوچھا زندگی میں بھی۔ نہ آئے بعدِ مردن بھی
خدا کو بھول جائیں سب جو شکل اپنی دکھا دو تم — کریں سجدہ مسلماں بھی پڑھیں کلمہ برہمن بھی
تم اپنی تیغ کی خونریزیاں عشاق سے پوچھو — عجب طوفاں بپا کرتی ہے موجِ آبِ آہن بھی
دلِ پُر داغ کافی ہے قفس میں دل بہلنے کو — یہیں سیرِ گلستاں ہو۔ یہیں لطفِ نشیمن بھی

کوئی دیکھے بوقتِ گریہ از خود رفتگی میری
عجب کیا ہے بہا لیجائے موجِ چین دامن بھی

آباد عظیم آبادیؔ

دردِ دل کہتا ہوں رو رو کر خدا کے سامنے — شرحِ حال آشنا ہے۔ آشنا کے سامنے
چکھ چکے ہم نعمتِ الوانِ شاہی کے مزے — ہیچ ہیں سب لذتِ فقر و فنا کے سامنے

کون سا جھونکا بجھا دیگا کسے معلوم ہے
زندگی اک شمعِ روشن ہے ہوا کے سامنے

غزل جناب رحم علی صاحب ہاشمی

مشکلیں پیدا کرے گی اب ہر آسانی مری
کہہ رہی ہے آج کچھ یوں ہی پریشانی مری

کر رہا ہے حسن دلکش خود نگہبانی مری
ہائے کیا کیا رنگ لائی ہے پریشانی مری

حسرت و اندوہ نے کی فاتحہ خوانی مری
کام آخر آ گئی بے ساز و سامانی مری

آتے جاتے ایک ہی ٹھوکر لگا دیں قبر کو
مجرم الفت ہوں یوں ہو فاتحہ خوانی مری

آنکھ کی پتلی میں دیکھو شکل اُن کی رہ گئی
ایک دن کام آ گئی آخر یہ حیرانی مری

ہیں علوم ساز ہستی کے خزانے اس میں فن
کہہ رہی ہے دُور سے یہ خانہ ویرانی مری

غزل شاکر

آنکھوں میں نہیں ہے کہ مرے دل میں نہیں ہے
تو جلوہ فگن کونسی محفل میں نہیں ہے

وہ آنکھ نہیں جس میں نہ ہو تیری تجلّی
وہ دل نہیں اُلفت تری جس دل میں نہیں ہے

کیونکر کہوں ہے ترک محبت کا ارادہ
کیوں آئے زباں پر جو مرے دل میں نہیں ہے

جاں بیچ کے بھی کوچہ راحت نہ ملے گا
آرام جو ڈھونڈو کسی منزل میں نہیں ہے

جز نام خدا کس سے ہوں امداد کا خواہاں
مشکل ہے کہ حامی کوئی مشکل میں نہیں ہے

اے قیس عبث ہے تجھے ناقہ کا تجسس
لیلیٰ تو ترے دل میں ہے محمل میں نہیں ہے

کب حوصلہ مشق ستم ان کو ہوا آہ
جب سانس بھی باقی تن بسمل میں نہیں ہے

لذت کش آزار نہ ہوگا کوئی مجھ سا
وہ کون سا غم ہے جو مرے دل میں نہیں ہے

تھی جا ہمیں یہ شاکر کہ یہیں مر کے گڑ جاتے گے
قسمت سے جگہ کوچۂ قاتل میں نہیں ہے

مائل دہلوی

شاد کب الطاف سے یہ خاطر ناشاد کی
مہربانی بھی تمہاری جان ہے بیداد کی

خاک ہو کے بھی نہ اس کوچہ میں ظالم رہ سکا
تو نے اے بادِ صبا مٹی مری برباد کی

ہائے دنیا سے یوں ہی پُر حسرت و ارماں چلے
آرزو کوئی نہ نکلی اس دل ناشاد کی

اللہ اللہ کیا خوشی ہے میرے مرنے کی یہاں
دھوم ہے چاروں طرف شورِ مبارکباد کی

دیکھنا مائل زمین شعر کی رنگینیاں
کیوں نہ ہو آخر تو مٹی ہے جہاں آباد کی

ایضاً

ہے بادۂ چشم مست کہ میخانہ گھر میں ہے
قامت نظر میں ہے کہ قیامت نظر میں ہے

اے سوزِ دل گداز یہ تیرا طفیل ہے
ڈوبی ہوئی جو آہ ہماری اثر میں ہے

ساقی بھی ہے شراب بھی۔ شیشے بھی۔ جام بھی
گھر میں خدا کے وہ نہیں جو میرے گھر میں ہے

اب آ گیا تو باغِ جہاں دیکھتا چلوں
اچھا ہے یا بُرا ہے مگر رہگذر میں ہے

کچھ کہہ تو مجھ سے اے دل بیتاب کیا بنی
کچھ تازہ تازہ خون مری چشم تر میں ہے

وہ دن گئے کہ زندہ دلوں میں شمار تھا
اب زندگی کشاکشِ شام و سحر میں ہے

اے آرزو ئے قتل مبارک ہو آج تو
خنجر ہے جس کا نام وہ اُن کی کمر میں ہے

قاتل اب اس کو ہے تری ٹھوکر کی آرزو
تن سے جدا پڑا ہے مگر درد سر میں ہے

مائل اٹھا نہ سجدہ سے رکتا نہیں ہوں میں
بحرِ کرم کا جوش مری چشم تر میں ہے

غزل منتظری

رُخ سے پردہ اُٹھائیے تو سہی
چاند سا منھ دکھائیے تو سہی

میری اُلفت کا حال کھل جائے
دِل کسی سے لگائیے تو سہی

مصحفِ رُخ کے ہم نہیں عاشق
آپ قرآں اُٹھائیے تو سہی

جان پر ہم بھی کھیل بیٹھے ہیں
اُٹھ کے پہلو سے جائیے تو سہی

سر جھکائے ہوئے ہیں دیر سے ہم
آپ خنجر لگائیے تو سہی

غیر بھرتے بہت ہیں عشق کا دم
ایک دن آزمائیے تو سہی

دِل اگر بیچنا ہے مدِ نظر
منتظری پاس لائیے تو سہی

غزل سید علی صاحب سجاد دہلوی

ہم اپنی زیست کا خود اہتمام کرلیں گے
یونہی وہ کہتے ہیں وہ کب بھلا خبر لیں گے

کہاں نصیب کہ اس در تلک رسائی ہو
ملے جو رستے گلی میں سلام کرلیں گے

یہ دل ہو شیشہ سے نازک ذرا خیال رہے
لگی جو ٹھیس تو پھر تم سے دام بھر لیں گے

کیا جو شکوۂ اُلفت بگڑ کے کہنے لگے
بھلا میں دیکھوں تو کیا آپ میرا کرلیں گے

وہ اور میری عیادت کو آئیں، اے توبہ
جنہیں خبر نہیں اپنی وہ کیا خبر لیں گے

کبھی تو عیش کی صورت دکھائی دیگی ہمیں
جہاں میں جتنے مصیبت کے دن ہیں بھر لیں گے

تسلیاں وہ مجھے دیں گے یا کہ دُشمن کو
ہیں اک عذاب میں کس کس کی وہ خبر لیں گے

خدا گواہ اُنھیں بھی ہے اُنس اے سجاد
سُنیں گے حال تو آنکھوں میں اشک بھر لیں گے

غزل جناب حامد حسن صاحب قادری

لحد سے اُٹھ کے ظالم دیکھ لوں میں تیری صورت بھی
جو آیا ہے تو کر دے چال سے برپا قیامت بھی

ترا غصہ بھی ہم کو یاد ہے تیری عنایت بھی
مری آنکھوں میں پھرتی ہو وہ صورت بھی یہ صورت بھی

یہ ممکن ہو کہ رہ جائے کوئی کپڑا سلامت بھی
سلامت چاہئے جوش جنوں بھی دست وحشت بھی

جب آئے ہجر کے دن گھر مرے تو ساتھ ہی اُن کے
چلی آئی سمٹ کر ساری دُنیا کی مصیبت بھی

مے گلگوں بھی کیا شے ہو جہاں یہ حلق سے اُتری
نکھر جاتی ہے رنگت بھی بدل جاتی ہو صورت بھی

جناب شیخ کیا کچھ آڑ میں تقویٰ کی کرتے ہیں
کوئی کیا ان کو جانے۔ ایک ہی حضرت ہیں حضرت بھی

اب اُن سے جو سامنا ہوتا ہو تو مونھہ پھیر لیتے ہیں
کہاں کی رسم اُلفت چھوڑ دی صاحب سلامت بھی

تمھاری یاد جب چٹکی لگاتی ہے مرے دل میں
کھٹک کرتا ہے پیدا کس مزے کی خار حسرت بھی

ہزاروں بار توبہ کی ہو میں نے بادہ نوشی سے
مگر بدلی کے آتے ہی بدل جاتی ہے نیت بھی

پشیمانی ذریعہ ہو گئی بخشش کا اے واعظ
بہے جب اشک تو بہنے لگا دریائے رحمت بھی

مصیبت کا کوئی ساتھی نہیں سب چھوڑ دیتے ہیں
زمانہ پھر گیا، تو پھر گیا وہ بے مروت بھی

کہا قاصد سے کہنا عمر بھر یوں ہی بسر ہو گی
کہاں کا خط ہمارا پڑھ چکے وہ خط قسمت بھی

کیا چاہت کا میں نے ذکر تو بولے خفا ہو کر
اجی دیکھی ہو تم نے چاہنے والوں کی صورت بھی

یہ کون آتا ہو وہ آتے ہیں شاید سیر گلشن کو
خبر کے ساتھ ساتھ اُڑنے لگی پھولوں کی رنگت بھی

اُٹھا ہے درد انکا جب کبھی نشتر لگانے کو
تو دل میں پھانس بنکر چبھ گئی ہو انکی حسرت بھی

ہوا دریا سے واقف قطرہ دریا میں فنا ہو کر
وہ مل جائیگا تو کھل جائیگی اس کی حقیقت بھی

ہمیں کیا حضرت عیسیٰ جلائیں اور تو مردے
مزا جب تھا۔ اگر کرتے علاج درد الفت بھی

بسر ہوتی ہے اپنی زندگی کس لطف سے حامد
خدا رکھے مزے کی چیز ہے درد محبت بھی

غزل جناب ریاض

حنا یہ کہتی ہو لو بزبان پا کے مجھے
جب آپ آئے گئے چور پاں لگا کے مجھے

حنا یہ کہتی ہو ان سے سنا سنا کے مجھے
نہیں شہیدوں میں ملنا لہو لگا کے مجھے

ذرا سے در و نے ڈھائی ہیں آفتیں کیا کیا
ٹپک دیا ہو زمیں پر اٹھا اٹھا کے مجھے

میں اپنے خم کا بڑا اٹھاؤں خود کیونکر
وہ پان دیتے ہیں شوخی سے مسکرا کے مجھے

یہ کیا مذاق فرشتوں کو آج سوجھا ہے
ہجوم حشر میں لے آئے ہیں بلا کے مجھے

سنانے والے قیامت بھی آئی جاتی ہے
جفا کے لطف نہیں آئیں گے وفا کے مجھے

کہاں وہ نور کی صورت وہ نور کی آواز
ریاض کون سنائے غزل یہ گا کے مجھے

ایضاً

اگنے تھے جن میں نخل امید وصال کے
کیا ہو گئے وہ باغ طلسم خیال کے

دل سے نکال ڈالے سب ارمان وصال کے
اب پھینک آئیں سینہ سو کیا دل نکال کے

ساقی ہمارے سامنے رکھدے تو بھر کے جام
لا دختِ رز کو نور کے سانچے میں ڈھال کے

بالوں میں اپنے بیٹھ کے موتی پرو دیئے
آنسو نہ پوچھئے کسی آشفتہ حال کے

محفلمیں آج شیخ کہن سال ناچ جائے
دو گھونٹ اسے پلا دو مئے کہنہ سال کے

ہیدرد تجھ کو بات کا جب بھی یقین نہ ہو
ہم رکھدیں سامنے جو کلیجہ نکال کے

دل کے لئے حسینوں کی ہم کو کمی نہیں
اچھا ہوا مال لاکھ خریدار مال کے

اٹھواؤ میز سے یہ وساغر ریاض جلد
آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے

غزل رسا رامپوری

ساقی ترے کرم سے کیا لطف آ رہا ہے
کوئی تو پی رہا ہے کوئی پلا رہا ہے

آئینہ خود نمائی اُن کو سکھا رہا ہے
کیا ظلم کر رہا ہے۔ کیا قہر ڈھا رہا ہے

چوری گیا گیا دل۔ لیکن غضب تو یہ ہے
دِل کا چُرانے والا آنکھیں چُرا رہا ہے

آنسو بہا رہا ہے وہ سوز دل پہ میرے
خود ہی لگا کے ظالم خود ہی بُجھا رہا ہے

انکو تو ہم نے چاہا وہ یوں ستا رہے ہیں
اے چرخ کینہ پرور تو کیوں ستا رہا ہے

کوچہ میں دُشمنوں کے ہم اور سجدہ کرتے
نقش قدم کسیکا سر کو جھکا رہا ہے

آزردہ غیر سے ہیں لیتا ہوں میں بلائیں
روٹھے ہیں وہ کسی سے کوئی منا رہا ہے

یہ کمسنی یہ باتیں۔ یہ سادگی۔ یہ گھاتیں
کوئی سکھانے والا اُن کو سکھا رہا ہے

کوچے میں ان بتوں نے آنے دیا نہ شاید
سنتے ہیں اب رسا بھی کعبے کو جا رہا ہے

غزل غالب

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوز غم ہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط منھ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

غزل غالب

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک شخص اور پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ تلافیِ دل مافات چاہیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

ہے رنگ لالہ و گل نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بحسبِ گردش پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

غزل تسلیم

اچھے اچھے بُت کے بندے اب خدا ہونے لگے
عاشق اس کافر ادا کے پارسا ہونے لگے

چاہتا ہوں اتنی ہیں تاثیر اپنے عشق میں
شرم کے اُٹھ جائیں پردے سامنا ہونے لگے

انتہا کی بے نیازی ابتدائے عشق میں
تم ابھی سے بے مروت بے وفا ہونے لگے

وہ مریضِ غم ہوں صحت کی ہوس تو اک طرف
نامِ درماں لوں تو دردِ دل سوا ہونے لگے

ڈر ہے بول اُٹھے کہیں اُنکی طرف ہی کی نہ دل
سامنے اللہ کے جب فیصلہ ہونے لگے

وقتِ آخر ہے اُنھیں رخصت کرو تسلیم اب
کون جانے کیا ہو دم میں کیا سے کیا ہونے لگے

غزل مومن

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے — فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہونگے

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہونگے — نیم بسمل کئی ہونگے کئی بے جاں ہونگے

تاب نظارہ نہیں۔ آئینہ کیا دیکھنے دوں — اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے — ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم — لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہونگے

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں — اور اگر ہوں گے تو بے وقت پشیماں ہونگے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس — ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہونگے

منت حضرت عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی — زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہونگے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی — پھر وہی پاؤں۔ وہی خار مغیلاں ہونگے

سنگ اور ہاتھ وہی، وہی سر و داغ جنوں — وہی ہم ہوں گے، وہی دشت و بیاباں ہونگے

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

غزل صولت

طبیعت میں نہ شوخی تھی نہ گرمی تھی ذرا پہلے — تمہارے ہاتھ پر چڑھتا نہ تھا رنگ حنا پہلے

کروں کیا دل کی بیتابی کو نالے کس طرح روکوں — برستے ہو مصیبت مجھ پر سنو تو ماجرا پہلے

ابھی کچھ دن ادھر الھڑپنے سے چال چلتے تھے — اتر پڑتا تھا شانہ سے دوپٹہ بار بار پہلے

ابھی کیونکر جگر کے داغ کی حالت دکھاؤں میں
تمہارے سامنے سے ہو تو آئینہ جدا پہلے

غزل جناب مائل دہلوی

قضا آئی ہو سینہ تک مرے قاتل کے ہاتھوں سے
بلائیں تیغ کی لیلوں دل بسمل کے ہاتھوں سے

سہارا کچھ تو دے مجنوں ذرا تو دل کے ہاتھوں سے
گرا پڑتا ہو پردہ صاحب محمل کے ہاتھوں سے

نہ چلتی کچھ بھی یوسفؑ کی۔ نہ ہوتی کچھ بھی رسوائی
پکڑ لیتی اگر دامن زلیخا دل کے ہاتھوں سے

تمہاری راہ کے کانٹے فرشتوں نے سمیٹے ہیں
کئی منزل کے آنکھوں سے کئی منزل کے ہاتھوں سے

خدا کے واسطے یارو مجھے اتنا تو سمجھا دو
کہاں تک سر کو پیٹوں ناصح جاہل کے ہاتھوں سے

ہزاروں انقلاب آئے۔ خدا کا گھر ہی کہلایا
بنا ہو خانۂ کعبہ کسی کامل کے ہاتھوں سے

خدا کے سامنے جا کر کروں فریاد کس کس کی
ہوا جو رنگ قاصد کا مرے قاتل کے ہاتھوں سے

یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ ہو اعمال کی خوبی
مصیبت ہم پہ جب آئی تو دل کے ہاتھوں سے

بچا کر آئے دامن غیر سے جو تم تو کیا آئے
بہت مشکل ہو بچنا عاشق کامل کے ہاتھوں سے

یہی لکھا ہے کیا گبر و مسلماں کے مقدر میں
کشاکش میں رہیں دونوں حق و باطل کے ہاتھوں سے

نگاہِ مست ساقی نے بنا رکھا ہے متوالا
گرا پڑتا ہے ساغر حضرت مائل کے ہاتھوں سے

غزل

افسوس ہو کہ مجھکو وہ یار بھول جاوے
وہ شوق وہ محبت وہ پیار بھول جاوے

رستم بھی تیری آنکھوں کے ہووے گر مقابل
آنکھوں کو دیکھ تیری تلوار بھول جاوے

کیا شیخ کیا برہمن جب عاشقی میں آویں
تسبیح کرے فراش، زنار بھول جاوے

یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتیں
جب تیرے آگے آوے گفتار بھول جاوے

غزلیاتِ جلال

اُن سے کچھ میرا بھی ذکر اے دلِ ناشاد رہے
وقت پر بھول نہ جانا یہ ذرا یاد رہے

کسی بیدرد کو میں حال سُناؤں اپنا
نالۂ خاموش رہے چُپ ابھی فریاد رہے

یار کی ایک جفا کے مرے دل میں سَو داغ
سَو وفائیں مری اور اک نہ اُسے یاد رہے

نامُرادوں کی ہوئیں آج وفائیں پوری
ہم کو ناشاد لقب اُس نے دیا شاد رہے

روح جنت میں نہ دل ہم میں نہ ہم مدفن میں
تیرے آوارہ پسِ مرگ بھی برباد رہے

اب کسی سے یہ کہیں گے کہ ہمیں رنج بھی دے
شاد ہونے کی تمنا میں تو ناشاد رہے

خیر بھولے نہیں وہ تیری وفاؤں کو جلال
یہ غنیمت ہے کہ چور اپنے اُنہیں یاد رہے

ایضاً

قیامت ہے طبیعت آگئی اُس آفتِ جاں پر
جسے اتنا نہیں معلوم اُلفت کیا وفا کیا ہے

اُنھیں بھی جوشِ اُلفت ہو تو لطف اُٹھے محبت کا
ہمیں دن رات گر تڑپے تو پھر اس میں مزا کیا ہے

مصیبت عین راحت ہے اگر ہو عاشقِ صادق
کوئی پروانے سے پوچھے کہ جلنے میں مزا کیا ہے

کوئی دم کا ہوں مہماں آچکی ہے جان ہونٹوں پر
وہی خود دیکھ لیں آکر کہ اب مجھ میں رہا کیا ہے

طبیبوں سے میں کیا پوچھوں علاجِ دردِ دل اپنا
مرض جب زندگی خود ہو تو پھر اس کی دوا کیا ہے

شعر

کوچۂ جاناں سے گیا شاید بیاباں کو جلال
شب سے وحشت خیز نالوں کی صدا آتی نہیں

غزل مضطر

ہر چند عرضِ حال کی جرأت نہیں مجھے
یہ تو نہیں کہ تجھ سے محبت نہیں مجھے

کس طرح سے کروں میں ادا طرزِ بندگی
جب تیری یاد سے یہاں فرصت نہیں مجھے

روتا ہوں اپنی شومیِ قسمت کو دیکھ کر
اک لفظ بولنے کی اجازت نہیں مجھے

سنتا نہیں جو تو تو کہوں کس سے مدعا
تیرے سوا کسی سے محبت نہیں مجھے

مضطر ہوں میں بھی حضرتِ غالب کا ہم خیال
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

غزل

جو وہ لطف سے ہمکلامی کریں گے
محبت کے بندے غلامی کریں گے

جو وہ جرمِ الفت پہ تعزیر دیں گے
تو حاصل بڑی نیکنامی کریں گے

کبھی جا و بیجا اطاعت نہ ہوگی
محبت میں کیا ہم غلامی کریں گے

اگر وہ نہیں بولتے ہیں نہ بولیں
ہمیں کوشش ہمکلامی کریں گے

یہاں پر نہ غیروں کو تم منہ لگانا
یہ منہ زور ہیں بد لگامی کریں گے

عبث دربئے الفتِ غیر ہو تم
وفا اور ایسے حرامی کریں گے

اشاروں سے کہتی ہے چشمِ سخن گو
کہ دل پر وہ قبضہ دوامی کریں گے

ترے تیر دل میں رہیں جائے حسرت
یہی اس کی قائم مقامی کریں گے

وہ انسان سے جب نہیں بات کرتے
تو حوروں سے کیا ہمکلامی کریں گے

ارادہ ہے اب نعت گوئی کا خادم
دل و جاں سے تقلیدِ جامی کریں گے

غزلیات غالب

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ایضاً

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے شکوہ کیا کریں
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

شاہ کی غسل صحت کی خبر
دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غالب

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ بنے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے

ایضاً

کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

ادھر یہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

غالبؔ

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اِک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اِک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جُز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھِستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بُت آئینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گذرے ہے میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کُفر
کعبہ مرے پیچھے ہے۔ کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اِک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالبؔ کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

غزل

سبز گلشن بھی شراب بھی ہے
ہم بغل رشکِ ماہتاب بھی ہے

ایک چلو اِدھر بھی اے ساقی
در پہ اِک خانماں خراب بھی ہے

دل میں آئے ہو آنکھ سے پردہ
شوخ چشمی بھی ہے حجاب بھی ہے

میری توبہ کا اب خدا حافظ
ابر ہے یار ہے شراب بھی ہے

غزل ضامن

دکھادے ہم کو جمال اپنا۔ ہیں جاں بلب ہوں یہ ٹال کیا ہے
یہ خاکساروں سے رنج کیا ہے۔ یہ بیکسوں سے ملال کیا ہے
تمہارے قدموں پہ دم نکلتا یہی تمنا ہے غمزدوں کی
جو بادشاہوں کا وصل چاہے۔ فقیر مسکیں مجال کیا ہے
اسی توقع میں عمر گزری۔ کہ یار ہم سے تو آ ملے گا
نہ ہم نے جانا کہ وصل کیا ہو۔ نہ ہم نے جانا وصال کیا ہے
یہ دلمیں حسرت ہی لے چلے ہم زباں پہ اپنی یہ ہے شکایت
کبھی نہ پوچھا کہ تیرا ضامن ہماری فرقت میں حال کیا ہے

ابر

کہیں آثار بربادی ہوں یا صدمہ گزرتا ہے — میں روتا ہوں اگر دیوار میں پانی بھی مرتا ہے
سہارا ہو خدا کے رحم کا مظلوم بندے کو — بڑا محسن وہ میرا ہے جو مجھ پر ظلم کرتا ہے
کچھ ایسی درد میں لذت ملی چھوڑا نہیں جاتا — میں خود نشتر لگاتا ہوں جو کوئی زخم بھرتا ہے
بُرے کو سب بُرا اچھے کو سب اچھا ہو دُنیا میں — اس آئینہ میں جو جیسا ہے ویسا عکس اُترتا ہے
بُرا جو ہو وہ کرتا ہے خوشامد اہل دُنیا کی — خدا کا ڈر نہیں جسکو وہی بندی سے ڈرتا ہے
خدا حامی ہو کار خیر میں مردانِ ہمت کا — زمانہ کچھ کہے بندہ تو اپنا کام کرتا ہے
لگا رہتا ہے میلا سا عدم کی راہ میں ہر دم — یہ وہ رستہ ہو جس رستہ سے اک عالم گزرتا ہے
ہے قاصد کس کا یہ پیک اجل تعظیم کو جس کی — شہنشاہِ زماں بھی تخت سے اپنے اُترتا ہے
سدا راحت اُسی کو ہو وہی مقصود بندہ ہے — جو ہر حالت میں ابر اپنے خدا کا شکر کرتا ہے

غزل مخمور لکھنوی

چاہیے اتنا ہی استغنا گدا کے واسطے
ہاتھ بھی اپنے نہ پھیلائے دعا کے واسطے

خاکساری پیشہ گر کر چاہیے روشندلی
آئینہ پر خاک ملتے ہیں صفا کے واسطے

اے دل بیمار جلتے جی نہ لے احسان غیر
نالۂ جانکاہ کافی ہے عصا کے واسطے

ہو مبارک تجھ کو جاہ و سلطنت ای شاہ حسن
فقر کافی ہے فقیر بے نوا کے واسطے

بس نوائے مخمور بہتر اگر وں انکار مے
وہ بُت بدمست دینا ہے خدا کے واسطے

غزل ضامن علی صاحب ضامن

دل کو ہمارے چاہ اب اس بیوفا کی ہے
دن رات جس کی چاہ میں خواہش قضا کی ہے

کس طرح چوم لوں میں کفِ پائے نازنیں
پابوس کی طلب ہو نہ رنگ حنا کی ہے

کیا آرزوئے وصل بُت بے وفا کی ہو
عادت جسے ہمیشہ سے جور و جفا کی ہے

ہر ہر قدم پر اُس کے اعجاز عیسوی
رفتار اس پری کی یہ ناز و ادا کی ہے

باب قبول اب تو عزیزو ہوئے ہیں بند
باز و شکستہ پا کہیں مرغ دعا کی ہے

خانۂ خدا میں سانپ نے آکر کیا ہو گھر
دل میں ہمارے یاد جو زلف رسا کی ہے

مجھ کو ہوائے شوق اُڑا لے چلی ادھر
دل میں ہوا بھری مرے اُس دلربا کی ہے

گلشن میں سیر کو وہ گیا نو بہار حسن
لب پر صدا یہ غنچوں کے صل علیٰ کی ہے

ہمکو خیال حور و پری بھی کبھی نہ تھا
اب چاہ ہیں تم کو یہ بھی تو قدرت خدا کی ہے

ناز و ادا کے صدقے تری بول چال کے
تو گالیاں دے ہم کہیں رحمت خدا کی ہے

کچھ خوف حشر کا نہیں ضامن کو یا علی
اُمید ہم کو ساقی روز جزا کی ہے

غزل غالبؔ

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم — برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس — مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق — سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل — سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہمدگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب — نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب — عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال — صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دل فریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

غزل جلیلؔ

مری طرف سے یہ بے خیالی، نہ جانے اُن کو خیال کیا ہے
کبھی نہ پوچھا ملال کیا ہے۔ کبھی نہ دیکھا کہ حال کیا ہے

مُبارک اغیار سے تعلق۔ نئی ہے چاہت، نیا تعلق
بَلا سے ہم ہوگئے تصدق۔ تمہیں اب اس کا ملال کیا ہے

تجھی کو جانا تجھی کو مانا، تجھی پہ دی جان غائبانہ
چُھپا نہیں کچھ مرا فسانہ۔ یہ اب جواب و سوال کیا ہے

وصال ہو یا رہے جدائی، تمہاری اے جان جلیسی مرضی
جو اپنی حالت تھی میں نے کہدی اب آگے میری مجال کیا ہے

نظر اُٹھائیں جو آرسی تو اُن سے پوچھوں یہ میں ہنسی سے
لگائی ہے آنکھ کیا کسی سے کہو تو یہ دیکھ بھال کیا ہے

درِ محبت کا اِک گدا ہوں پری کا طالب نہ حور کا ہوں
تجھی کو تجھ سے میں چاہتا ہوں بس اور میرا سوال کیا ہے

کہاں تک اے واعظو یہ جھگڑے مزے اُڑا لیے وہ بیخودی کے
جو ہوش میں ہوں تو میں یہ سمجھوں، حرام کیا ہے حلال کیا ہے

اِدھر خطا ؤں پہ اشک جاری۔ اُدھر سے دریائے لطف جاری
وہ پیار سے ہائے اُن کا کہنا چلو بھی اب انفعال کیا ہے

بس اب محبت سے ہاتھ اُٹھاؤ بھلے کہنے میں مان جاؤ
نہ آپ کو اس طرح مٹاؤ۔ جلیلؔ دیکھو تو حال کیا ہے

غزل غافل شاگرد مصحفی

نگاہ یار ہم سے آج بے تقصیر پھرتی ہے
کسی کی کچھ نہیں چلتی ہے جب تقدیر پھرتی ہے

مرقع ہے مری آنکھوں میں کیا یاران رفتہ کا
جو نظروں کے تلے ہر ایک کی تصویر پھرتی ہے

کبھی تو کھینچ لائیگی اُسے گور غریباں تک
کہ مدت سے ہماری خاک دامنگیر پھرتی ہے

بیاں کس منھ سے ہووے یار کی شیریں کلامی کا
زباں تک اپنی اب تک لذت تقریر پھرتی ہے

مقام عشق میں شاہ و گدا کا ایک رتبہ ہے
زلیخا ہر گلی کوچہ میں بے توقیر پھرتی ہے

خدا شاہد ہے اسکا پھر نہیں ملتی نہیں ملتی
طبیعت جس سے اپنی او بت بے پیر پھرتی ہے

ہم اُس لیلےٰ کے دیوانے ہیں غافل جو کہ صحرا میں
بغل میں اپنے مجنوں کی لیے تصویر پھرتی ہے

غزل مالک الدولہ صولت

اے دل تجھ کو خیال کیا ہے
کُمھلا گیا کیوں ملال کیا ہے

دانستہ وہ مجھ سے پوچھتے ہیں
مطلب کیا ہے سوال کیا ہے

ماشاء اللہ ابھی سے ہو شوخ
کیا عمر ہے سن و سال کیا ہے

سنتے نہیں ہم سوائے قلقل
اے شیخ یہ قیل و قال کیا ہے

لاکھوں ہیں بناؤ سادگی میں
آرائش خط و خال کیا ہے

دیکھو دیکھو نہ حشر ہو جائے
سنبھلو سنبھلو یہ چال کیا ہے

مسلا ہے کسی کا غنچۂ دل
ہتی میں یہ لال لال کیا ہے

بوسہ ہونٹوں کا لوں جو بے حکم
کیا منھ ہے مرا، مجال کیا ہے

غزل مائلؔ دہلوی

وہ جلوہ ہے کہ دل محوِ تماشا ہو ہی جاتا ہے
حرم پر بتکدہ یکتا اب بھی دھوکا ہو ہی جاتا ہے

تمہاری شوخیاں برہم زنِ عالم ہی سہی لیکن
ہماری آہ سے بھی حشر برپا ہو ہی جاتا ہے

تصوّر سے تمہارے دلکو تسکین دے ہی لیتے ہیں
تم آؤ یا نہ آؤ کام اپنا ہو ہی جاتا ہے

بگڑتے کیوں ہیں اپنے آپ میری بدگمانی پر
محبت دلمیں ہوتی ہو تو کھٹکا ہو ہی جاتا ہے

یہی عالم ہے برسوں سے جہاں فصلِ بہار آئی
نہیں بچتی مری توبہ کچھ ایسا ہو ہی جاتا ہے

بھروسہ مبدءِ فیاض پر رکھتا ہو کیا کیا کچھ
سخن سنجوں میں جو مائلؔ کو دعویٰ ہو ہی جاتا ہے

دیگر

مری چشم کیوں نہ ہو خوں فشاں، نہ رہی وہ بزم نہ وہ سماں
نہ وہ طرزِ گردشِ چرخ ہے نہ وہ رنگ لیل ونہار ہے

جہاں کل تھا غلغلہ طرب، وہاں ہائے آج یہ ہے غضب
کہیں ایک مکاں گرا ہوا، کہیں ایک شکستہ مزار ہے

غم و یاس و حسرت و بیکسی کی ہوا کچھ ایسی ہے چل رہی
نہ دلوں میں اب وہ اُمنگ ہے نہ طبیعتوں میں اُبھار ہے

ہوئے مجھ پہ جو ہیں ستم فلک، کہوں کس سے انکو کہاں تلک
نہ مصیبتوں کی ہے کوئی حد نہ مرے غموں کا شمار ہے

مرا سینہ داغوں سے ہے بھرا، مرے دل کو دیکھیے تو ذرا
یہ شہیدِ عشق کی ہے لحد پڑا جسپہ پھولوں کا ہار ہے

میں سمجھ گیا وہ ہیں بے وفا، مگر اُن کی راہ میں ہوں فدا
مجھے خاک میں وہ ملا چکے، مگر اب بھی دلمیں انکے غبار ہے

غزل حالی

جنوں کار فرما ہوا چاہتا ہے
قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے

دمِ گریہ کس کا تصور ہے دل میں
کہ اشکوں سے دریا بہا چاہتا ہے

خط آنے لگے شکوہ آمیز اُن کے
ملاپ اُن سے گویا ہوا چاہتا ہے

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو
وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے

ابھی لینے پائے نہیں دم جہاں میں
اجل کا تقاضا ہوا چاہتا ہے

بہت چین سے دن گزرتے ہیں حالی
کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

غزل حسرت

دلِ مایوس کو سرچشمۂ صدق و صفا کر دے
گداز غم اگر چاہے تو مجھ کو باخدا کر دے

عطا ہو اُس وفا دشمن کو توفیقِ کرم یا رب
نہیں تو پھر مجھی کو بے نیازِ مدعا کر دے

تقاضا کر رہا ہے اب یہ حسنِ تازہ کار اُس کا
کہ جس نے دل دیا تھا جان بھی ہم پر فدا کر دے

اثر ایسا کہاں سے لاؤں یا رب اپنے نالہ میں
جو اُس بے مہر کو بھی رازِ غم سے آشنا کر دے

گراں گزریگا حرفِ آرزو اُس طبعِ نازک پر
نگاہِ شوق اس مفہومِ رنگیں کو ادا کر دے

ہُوا جاتا ہے نورِ عشق پر دُودِ ہوس غالب
الٰہی اہلِ حق سے لوثِ باطل کو جدا کر دے

غرورِ حسن کی تاثیر سے ڈر ہے مجھے حسرت
کہیں ایسا نہ ہو یہ حُسن کو بھی خود نما کر دے

غزلِ غالب

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منھ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور دُرویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

غزل نواب سراج الدین احمد صاحب سائل دہلوی

ہے گوارا دل سے جو کچھ ہو پریشانی مجھے
مدعا یہ ہے کہ شہرت عشق میں بانی مجھے

فصلِ گل آتے ہی وحشت ہے گریباں گیر پھر
پھر برنگ گل ہوا ہے ذوقِ عریانی مجھے

وعدۂ دشمن کو بھولا یا مرے گھر آ گیا
ہے اداؤں سے تری ظاہر پشیمانی مجھے

یاد آتی ہے وہی زلفِ سمن بو اور بھی
بُوئے گل سے اور ہوتی ہے پریشانی مجھے

میرے مطلب کی نہیں ہے۔ بات آ کر سُن تو لو
تم سے کہنا ہے تمہارا رازِ پنہانی مجھے

ساقیِ کوثر سُنا کرتا تھا میں کوثر کا نام
وہ بھی چشمہ ہے تو پلوا دیجئے پانی مجھے

کس کا بیٹا کس کا پوتا۔ نام سائل زادہ وا
کیا سے یہ کیا کر دیا۔ اے خانہ ویرانی مجھے

غزل مخزمہ اقبال بیگم صاحبہ نرگ

کر ینگے اب تو خود ہی مدعا ئے دلِ بیاں اپنا
دل اپنا۔ مدعا اپنا۔ زباں اپنی دہاں اپنا

ہمیں دل سے رہا کیا کام جب جاتا رہا ہم سے
چمن سے ہم کو کیا مطلب جو اُجڑا آشیاں اپنا

گلستانِ جہاں میں ہوں میں اک حسرت نوا بلبل
نہ کوئی ہم قفس اپنا نہ کوئی ہم زباں اپنا

کہے کوئی انا الحق ہم انا المحبوب کہتے ہیں
سر اپنا۔ شور اپنا۔ جان اپنی۔ امتحاں اپنا

بھلا حالِ دلِ خوں کردہ فرقت کہیں کس سے
نہیں ہمراز دُنیا میں کوئی اے نرگ ہاں اپنا

غزل جناب اخگر

کیا لگا تیں دل محبت کا مزہ جاتا رہا
بیوفائی رہ گئی نام وفا جاتا رہا

ہمنشینوں دل مرے پہلو سے کیا جاتا رہا
زندگی کا لطف اُلفت کا مزہ جاتا رہا

وہ اُمنگیں ہیں نہ اب دلمیں نہ وہ جوش شباب
اک جوانی کیا گئی سارا مزا جاتا رہا

راحت و آرام کھو بیٹھے ہیں جسکی عشق میں
ہائے اتنا بھی نہ پوچھا اُس نے کیا جاتا رہا

یہ کہیں گے وہ کہیں گے دلمیں ٹھانے تھے بہت
چار آنکھیں ہوتے ہی سارا گلہ جاتا رہا

اور کیا رکھیں ہم اے نازک ادا تجھ سے اُمید
جھوٹی باتوں کا تری جب آسرا جاتا رہا

تم جو آئے پاس بس اتنی تسلی ہو گئی
مضطرب ہونا دلِ بیتاب کا جاتا رہا

دوستی دُنیا میں ہے خلقی وہ خود غرضی کی ہے
سب ہے اب ملنے ملانے کا مزا جاتا رہا

رک گئے آنسو مرے جب کم ہوا دل کا بخار
گھٹ گئی گرمی برسنا ابر کا جاتا رہا

بیخودی ایسی بھی کیا اخگر کسی کے عشق میں
آدمیت سے بھی اے مردِ خدا جاتا رہا

جناب اکبر الہ آبادی مرحوم مغفور

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے

ناتجربہ کاری واعظ کی یہ باتیں ہیں
اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے

اس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مے سے دل ہی میں جو کھنچی ہے

اے شوق وہی پی لے اے ہوش ذرا سو جا
مہمان نظر اس دم اک برق تجلی ہے

واں دل میں کہ بس دکھ دو یاں جی میں کہ سب لو
انکا بھی عجب دل ہے میرا بھی عجب جی ہے

ہر ذرہ چمکتا ہے انوار الٰہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

سورج میں لگے دھبہ فطرت کے کرشمے ہیں
بت ہمکو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے

ہم جان سے یوں جائیں تم یوں رہو پھیرے
یہ بات نہیں سمجھو بیجا ہے کہ اچھی ہے

تعلیم کا شور ایسا تہذیب کا غل اتنا
برکت جو نہیں ہوتی نیت کی خرابی ہے

سچ کہتے ہیں شیخ اکبر ہے طاعت حق لازم
ہاں ترک مے و شاہد یہ اُن کی بزرگی ہے

غزل نواب آصف الدولہ

یہ اشک چشموں میں اب جم رہے رہے نہ رہے
حباب وار کوئی دم رہے رہے نہ رہے

عرق ہے منھ پہ ترے خوشنما صنم لیکن
ہمیشہ گل پہ یہ شبنم رہے رہے نہ رہے

تو اپنے شیوہ جور و جفا سے مت گزرے
تری بلا سے مرا دم رہے رہے نہ رہے

قمر کو ہوتا ہے ہر ماہ میں کمال و زوال
ترے بھی حسن کا عالم رہے رہے نہ رہے

جو وصل میں ہو جدائی تو کیا کرے آصف
یہ اتفاق بھی باہم رہے رہے نہ رہے

غزل

بے خوف ہو کے پھر تو خطا پر خطا کریں	بڑھ جائیں حوصلے جو سزا پر سزا ملے
ان کو جفائیں کر کے مٹانے سے کام ہے	حسرت ملے۔ اُمید ملے۔ مدعا ملے
تسکین بھی دوا ہے تڑپ بھی علاج ہے	ہم سب میں خوش ہیں درد ملے یا دوا ملے
شکوہ کسی سے دل کے نہ ملنے کا کیا کریں	دو حرف لفظ دل میں ہیں وہ بھی جدا ملے
بیتاب دل جو ہو تو سنبھلتا ہے کس طرح	ہم پوچھ لیں کہیں جو کوئی مبتلا ملے

دیکھا جو ہم نے تم کو تو آنکھیں نکال لیں
آئینہ گھورتا ہے اسے بھی سزا ملے

غزل رونق

نکلے لبوں سے نکلے دو حرف پیار کے	بوسے مری زباں نے لیے نطقِ یار کے
لایا شباب رنگ دن آئے بہار کے	گل باغِ آرزو میں کھلے ہیں بہار کے
نکلے نہ حوصلے دلِ اُمیدوار کے	ٹوٹے تری گلی میں قدم اغنیا کے
تاریک ہو گئی ہے مری صبحِ آرزو	پردے پڑے ہوئے ہیں شبِ انتظار کے
شعلے زمیں پر ہیں تڑپ آسمان پر	نالوں میں میرے رنگ ہیں برق و شرار کے
لائے جنوں میں رنگ ہرے ہو کے زخمِ دل	کپڑے ملے خزاں کو بھی فصلِ بہار کے
ٹھکرا کے تم نے خاک کا رتبہ بڑھا دیا	گردوں پہ اب دماغ ہیں مشتِ غبار کے
جوشِ جنوں میں تلوے ہیں نشتر بنے ہوئے	انداز میرے چھالوں میں ہیں نوکِ خار کے
کرتا ہوں ضبط گریہ تو بڑھتا ہے سوزِ غم	جھگڑے پڑے ہوئے ہیں چڑھاؤ اتار کے
رنگِ سخن ہمارا ہے رونق یہ سرسری	لکھتے نہیں غزل کبھی ہم زور مار کے

غزل شاد

کیوں اے فلک جو ہم سے جوانی جدا ہوئی
اک خود بخود جو دل میں خوشی تھی وہ کیا ہوئی

گستاخ بلبلوں سے بھی بڑھ کر صبا ہوئی
کچھ جھک کے گوشِ گل میں کہا اور ہوا ہوئی

مایوس دل نے ایک نہ مانی امید کی
کہہ سُن کے یہ غریب بھی حق سے ادا ہوئی

چھوڑا یہ جسم رُوح پُر ارماں نے شکر ہے
عرضی مری لفافۂ خط سے جدا ہوئی

دل اُن کے اختیار میں ہیں اُن کے ہاتھ میں
اب تک نہ کچھ کھلا کہ مری کیا خطا ہوئی

دُنیا کی فکر موت کا ڈر آبرو کا دھیان
دو دن کی زندگی مرے حق میں بلا ہوئی

موتی تمہارے کان کے تھرا رہے ہیں کیوں
فریاد کس غریب کی گوش آشنا ہوئی

اس عمر کا عدم میں کہیں سامنا نہ ہو
مر جاؤں گا وہاں بھی جو یہ بے حیا ہوئی

صد شکر بعد مرگ بھی ضائع گیا نہ میں
مٹی مری زمینِ لحد کی غذا ہوئی

بیگانہ وار رہتے تھے برسوں سے یوں تو وہ
حد ہے کہ اب نگاہ بھی نا آشنا ہوئی

برسا جو ابر رحمتِ خالق بروز حشر
سبزہ کی طرح پھر مری نشو و نما ہوئی

بیماریوں سے چھوٹ گئے اے شاد حشر تک
قربان اس علاج کے اچھی دوا ہوئی

غزل نسیم

برہم ہیں وہ غیر بے حیا سے
مانگیں کچھ اور بھی خدا سے

اچھا۔ اچھا۔ عدو سے ملیئے
جاؤ۔ جاؤ۔ اجی بلا سے

کیا حال کہیں دل و جگر کا
ٹکڑے ٹکڑے ہیں جا بجا سے

دیکھا سب کو نسیم دیکھا
خاموش بیانِ مدعا سے

غزل ظفر

باہیں مرے رقیب کی گردن میں ڈال کے
مجھ سے مزے وہ پوچھ رہے ہیں وصال کے

دل لیجیے تو دل کے سب ارماں نکال کے
کانٹوں بھرا ہے پھول ذرا دیکھ بھال کے

دام بلا ہے ان کے کوئی چھوٹتا نہیں
حلقے نہیں ہیں زلف کے پھندے ہیں جال کے

منقل ہیں آج وہ خوشی سے اُچھل پڑے
سر بعدِ ذبح نوکِ سناں پر اُچھال کے

ہوگا وہی ازل سے جو قسمت میں ہے لکھا
قائل کبھی شگون کے ہم ہیں نہ فال کے

مے سے گریز ہے انھیں فصلِ بہار میں
کیا جانے شیخ آدمی ہیں کس خیال کے

اُف رے غرورِ حسن کی بے اعتنائیاں
کرتے ہیں ہم سے بات تو تیور ڈھال کے

دُنیا ہے اس کا نام بڑی بیسوا ہے یہ
دھوکے میں ہم نہ آئیں گے اس پیرزال کے

عشاق نامراد کی بر آئے کیا مراد
ہیں چار حرف چاروں ہی خالی وصال کے

خاطر جنابِ شیخ کی ہاں کچھ تو چاہیے
ساقی انھیں جو دینا تو ساغر کھنگال کے

سوزِ دروں نے پھونک دیے ہیں دل و جگر
لا ساقیا شراب دے شورے میں جھال کے

انگور سے نچوڑ کے واعظ پیا کرے
چسکے ہمیں پڑے ہیں مے کہنہ سال کے

میری شبِ سیاہ کس آفت کی رات ہے
تارے مجھے ڈراتے ہیں دیدے نکال کے

یہ شرط ہو بغل میں کوئی نوجواں بھی ہو
ہیں قدرداں ظفر بھی مے کہنہ سال کے

غزل عزیز

ہم گزشتہ صحبتوں کو یاد کرتے جائیں گے
آنے والے دَور بھی یونہی گزرتے جائیں گے

یہ تو سوچو دل ہی کیا ہے مجرمانِ عشق کا
سامنے جائیں گے لیکن ڈرتے ڈرتے جائیں گے

اِک نہ اِک دن دیکھ لینا یہ ورق اڑ جائیگا
چند آہیں ایسی ہم دُنیا میں بھرتے جائیں گے

مرنیوالوں نے دکھائی ہیں بہت کچھ قوتیں
خیر آہِ بے اثر اک ہم بھی کرتے جائیں گے

دو نگاہیں یہ آفتاب روزِ محشر کو عزیز
میرے زخمِ دل سے جو بچا ہے اُترتے جائیں گے

جناب عبد الغفار صاحب مفتوں دہلوی

تڑپنے کا دل مضطر کبھی عقدہ کھلے گا بھی / ارے ناداں مچلنا کیوں ہو کچھ آخر کہے گا بھی

عدو نے بھی بڑھایا تو ہے تم سے ربط ضبط اپنا / مگر میری طرح یہ میل جول ان سے نبھے گا بھی

ہوا ہے شمع پر پروانے کے جلنے سے یہ روشن / کسی کو جو جلائے گا تو بیشک وہ جلے گا بھی

تری محفل میں اے واعظ کسی سے کیا ہنسیں بولیں / جہاں دلبستگی ہوگی وہیں کچھ دل کھلے گا بھی

سمجھ کر راہ ہیں سب اونچ نیچ انساں قدم رکھے / چلے گا دوڑ کر جو بے تحاشا وہ گرے گا بھی

بھلا روز شمار ان بے شمار اپنے گناہوں کو / کہاں تک وہ گنے جائیگا جو کوئی گنے گا بھی

جو تم نے ظلم سیکھے ہیں مجھی پر آزماؤ گے / مجھی پر ختم ہوں گے سب کہ کچھ باقی رہے گا بھی

یونہی لب تک رہیگا دور دورہ درد فرقت کا / الٰہی یہ کسی کروٹ کسی پہلو تھمے گا بھی

مرا دل ہے تمہارا تو نہیں مرتا ہے مرنے دو / تمہیں کیا مرنے جینے سے مریگا بھی جیے گا بھی

عبث کرتے ہیں فکر رزق وہ رزاق مطلق ہو / کیا ہے اس نے وعدہ تو دلائیگا بھی دیگا بھی

ہماری سی زباں میں اس زمیں میں ہو غزل کس کی
وہ اپنی ہی سی اے مفتوں کہے گا جو کہے گا بھی

عالیجناب حاجی سید وحید الدین احمد صاحب بیخود دہلوی جانشین جناب داغ

نغمۂ شادی بھی سنتا ہے کوئی فریاد بھی / بزم میں بیٹھے ہوئے ہیں شاد بھی ناشاد بھی

ختم تھا نغمہ بھی مجھ پر نالۂ فریاد بھی / باغباں بھی یاد کرتا ہے مجھے صیاد بھی

جب تمنا مٹ گئی انکار ان کا مٹ گیا / مرثیہ بھی ہم نے لکھا ہے مبارکباد بھی

ان حسینوں کو نئی چالیں سکھاتا ہے فلک / دونوں دشمن ہیں مرے شاگرد بھی استاد بھی

ہم سے کچھ وعدہ ہوا تھا ہم سے کچھ قول و قرار / وہ زمانہ وہ گھڑی وہ دن تمہیں ہے یاد بھی

اس سخن فہمی کے صدقے ان اداؤں کے نثار / گالیاں بھی شعر پر ملتی ہیں مجھ کو داد بھی

زندہ تھا بیخود کے دم سے نام داغ و میر کا / آج رخصت ہو گیا وہ خانماں برباد بھی

غزل اختر

شوخی نہیں دیکھی کہ شرارت نہیں دیکھی
ہاں آپ کی آنکھوں میں مروت نہیں دیکھی

اظہارِ محبت پہ ہنسی آتی ہے ہنس لو
تم نے ابھی تاثیرِ محبت نہیں دیکھی

جاتے ہوئے دیکھا نہیں کب تجھ کو سوئے غیر
آتی ہوئی کس روز قیامت نہیں دیکھی

مانا نہیں اُس نے کہ یہ عاشق ہے ہمارا
جب تک کسی ناشاد کی تربت نہیں دیکھی

باقی نہیں وہ رنگ وہ روپ اُن پہ شبِ وصل
اس طرح بھی لٹتی ہوئی دولت نہیں دیکھی

کیا آئے نظر میں کسی بیکس کی مصیبت
ظالم کبھی تو نے شبِ فرقت نہیں دیکھی

بلبل سے ہے چھیڑ اُن کی تو پھولوں سے ہنسی ہے
اس رنگ کی واللہ طبیعت نہیں دیکھی

یہ کیا کہ دبے جاتے ہو تم بارِ نظر سے
ایسی بھی کہیں ہم نے نزاکت نہیں دیکھی

خونِ دلِ بلبل نے عجب کام کیا ہے
پھولوں میں کبھی ہم نے یہ رنگت نہیں دیکھی

دیکھا ہے کہ آتی ہوئی ٹل جاتی ہے لیکن
ٹلتی ہوئی سر سے شبِ فرقت نہیں دیکھی

اتنا بھی نہ چاہو کسی مہ پارہ کو اختر
تم نے کبھی آئینے میں صورت نہیں دیکھی

عالیجناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی

واعظ بتانِ دیر سے نفرت نہ کیجیے
کج بحثیٔ مجاز و حقیقت نہ کیجیے

اُٹھیے نہ آپ بزم سے غصہ میں اس قدر
جاتا ہوں میں حضور قیامت نہ کیجیے

یاد آ ہی جاتا ہے کبھی ناصح کا قول بھی
سب کیجیے جہاں میں محبت نہ کیجیے

بیداد اور اس پہ یہ تاکید الحذر
آجائے دم لبوں پہ شکایت نہ کیجیے

زندوں میں اب شمار نہیں حضرتِ عزیز
کہتے تھے آپ سے کہ محبت نہ کیجیے

غزل

یہی نقشہ ہے یہی رنگ ہو ساماں یہی
یہ جو صورت ہو تری صورت جاناں یہی

اپنی ہستی کے سوا غیر کو سجدہ ہو منع
مذہب پیر مغاں مشرب رنداں ہی یہی

کفر و اسلام سے کچھ کام نہیں تیرے سوا
عاشقوں کا تو یہی دین ہے ایماں ہو یہی

بستر اٹاٹ کا دو پارچہ کمبل کی کلاہ
تاج خسرو ہو یہی تخت سلیماں ہے یہی

غزل میر ضیا دہلوی

اک چاند سی صورت کا ہو جلوہ مرے آگے
بیٹھا ہے بت آئینہ سیما مرے آگے

اے ہمدم واب کیا مجھے دیتے ہو تسلی
لینا ہی نہ تھا نام کسی کا مرے آگے

دن رات جو صحبت ہو مجھے سیمتنوں کی
پھیلی ہوئی ہے دولت دنیا مرے آگے

کس لطف کی ہو چیز مری چشم تصور
رکھدیتی ہے اس بت کا سراپا مرے آگے

تم تو شب وعدہ کبھی آتے ہو نہ آؤ
آجاتا ہے تقدیر کا لکھا مرے آگے

فرقت میں یہ طوفان اٹھا کرتے ہیں ہر شب
بہ جاتا ہے اک اشک کا دریا مرے آگے

مرجانے کی ہے بات کہ آج اس نے عدو کو
چلمن سے نظر ڈال کے دیکھا مرے آگے

میں رند سمجھتا ہوں اسے جام جہاں بیں
آتا ہے جو پیمانہ صہبا مرے آگے

اے واعظ ناداں یہ مرے قلب و جگر ہیں
تو توڑتا ہے ساغر و مینا مرے آگے

بیماروں سے اپنے وہ یہ فرماتے ہیں اکثر
چلتا نہیں اعجاز مسیحا مرے آگے

دیوانۂ الفت ہوں ضیا خلق میں مشہور
ہوتا نہیں اب قیس کا چرچا مرے آگے

غزل عشرت

شب فراق ہیں دل پر قلق ابھی سے ہے
سحر ہے دور مرا رنگ فق ابھی سے ہے

ابھی لکھا ہی نہیں حال دل کا اے قاصد
ہوائے شوق میں اڑتا ورق ابھی سو ہے

ہنوز دفن ہوا ہی نہیں ترا بسمل
کہ زلزلہ ہیں زمیں کا طبق ابھی سے ہے

ارادہ سیر کا کرنا ہے جب کہ وہ گلرو
یہ نازہ ہے کہ جبیں پر عرق ابھی سو ہے

کسی نے شام کو آنے کو کیا کہا عشرت
یہ منھ پہ آپ کے پھولی شفق ابھی سے ہے

غزل جناب ریاض

شب فرقت ابھی گھٹ جائے ظالم آنکھ کے تل سے
تری تصویر پل جائے لگی ہو یہ مرے دل سے

جوانی میری رخصت ہو رہی ہو موت سے پہلے
الٰہی کارواں یہ لٹ رہا ہو دور منزل سے

نہ ان سا شوخ ہو کوئی نہ مجھ سا کوئی دیوانہ
بہانہ آتے ہی لڑ جائیں گے وہ مجھ کو عنادل سے

سنبھالے کیا مزہ آفت نگہ ہو چوٹ کرنے میں
ذرا سی تیغ نکلی جا رہی ہو دست قاتل سے

لحد میں کہنگی نے شکل میری اس قدر بدلی
فرشتے حشر کے دن مجھ کو پہچانینگے مشکل سے

ارے او قیس دیکھی بے اثر دیوانگی میری
تری محمل نشیں لیلیٰ نے جھانکا بھی نہ محمل سے

وہ خون بیگنہ کو اپنے دامن تک سمجھتے تھے
نظر آیا نہ لگا محشر کا دامن خون بسمل سے

زبان تیغ بھی چپ ہو دہان زخم بھی چپ ہے
سنا ہے داور محشر کہ پرسش ہو گی قاتل سے

وہ باتیں کچھ نہ ہوں جنکا اثر ہو شمع پر اتنا
اٹھی وہ جل کے خلوت سے اٹھی وہ رکے محفل سے

کسی کا لطف خضر راہ ہو تو راہ آساں ہو
نہ پیچیدہ جاوے پانو جب نکلا سلاسل سے

غبار راہ تو ہی کچھ مدد دے اب ذرا اٹھ کے
مجھے پہنچا دے منزل تک پڑا ہوں دور منزل سے

ریاض حق آئے تو کیونکر حشر میں آئے مرے مالک
یہ دیوانہ ترا واقف نہیں آداب محفل سے

غزل

تھک تھک کے نہ بیٹھیں گے نہ مرمر اُٹھیں گے
اب ظلم نہ ہم سے دلِ مضطر کے اُٹھیں گے

افسانۂ غم ان کو سناؤں نہ سناؤں
ڈرتا ہوں کہ وہ خواب میں ڈر ڈر کے اُٹھیں گے

چھیڑا ہے اگر تذکرۂ عشق تو سن لو
یہ قصہ تو پورا ہی بیاں کر کے اُٹھیں گے

دنیا ہی میں کر پرسشِ مظلوم الٰہی
جب حشر میں اُٹھیں گے تو پتھر کے اُٹھیں گے

دیکھیں گے وہ جب ناز سے میں نالہ کروں گا
فتنے یہ برابر سے برابر کے اُٹھیں گے

قاتل ترے کشتوں کا سنبھلنا نہیں آساں
وہ روزِ جزا بعد پہر بھر کے اُٹھیں گے

غزل جنابِ مائل دہلوی

ہے یاد چشمِ مست کہ میخانہ گھر میں ہے
قامت نظر میں ہے کہ قیامت نظر میں ہے

اے سوزِ دل گداز یہ تیرا طفیل ہے
ڈوبی ہوئی جو آہ ہماری اثر میں ہے

ساقی بھی ہو شراب بھی شیشے بھی جام بھی
گھر میں خدا کے وہ نہیں جو میرے گھر میں ہے

اب آ گیا تو باغِ جہاں دیکھتا چلوں
اچھا ہے یا برا ہے مگر رہ گذر میں ہے

تو کہہ تو مجھ سے اے دلِ بیتاب کیا بنی
کچھ تازہ تازہ خون مری چشمِ تر میں ہے

وہ دن گئے کہ زندہ دلوں میں شمار تھا
اب زندگی کشاکشِ شام و سحر میں ہے

اے آرزوئے قتل مبارک ہو آج تو
خنجر ہے جس کا نام وہ ان کی کمر میں ہے

قاتل اب اس کو ہے تری ٹھوکر کی آرزو
تن سے جدا پڑا ہے مگر درد سر میں ہے

مائل اُٹھا نہ سجدے سے روتا نہیں ہوں میں
بحرِ کرم کا جوش مری چشمِ تر میں ہے

غزل

درِ مصطفےٰ سنگِ موسیٰ نہیں ہے
یہاں عرش ہے طورِ سینا نہیں ہے

رُکے شہ تو پردہ سے آواز آئی
کہ پردے میں اب تجھ سے پردہ نہیں ہے

اُٹھاؤ تو برقعہ کو چہرے سے صاحب
ابھی ہم نے جی بھر کے دیکھا نہیں ہے

کُجا نورِ احمد، کُجا ماہِ تاباں
یہ وہ نُور ہے جس میں دھبہ نہیں ہے

چلو وادیِ عشق میں پا برہنہ
یہ جنگل وہ ہے جس میں کانٹا نہیں ہے

وہ ہے کون جو تجھ پہ شیدا نہیں ہے
کسے تیری نظروں نے مارا نہیں ہے

کہا جوش میں آ کے حضرت سے حق نے
جو تیرا نہیں ہے وہ میرا نہیں ہے

غزل ضامنؔ

اگر حاصل تجھے حق الیقیں ہے
وہ ہر دم پاس تیرے نازنیں ہے

کہیں وہ ظاہر اور باطن کہیں ہے
کہیں وہ جلوہ گر پردہ نشیں ہے

جسے تو ڈھونڈھتا آہوئے چیں ہے
وہ نافہ ناف میں تیرے کہیں ہے

ارے او طالبِ منزل گہہ یار
رگِ جاں سے بھی تیرے وہ قریں ہے

تمام عالم میں جسکو ڈھونڈھتا ہے
ترے قالب میں وہ پردہ نشیں ہے

نہ ہم ہیں اور نہ یہ اپنا مکاں ہے
فقط حیرت ہے اور کچھ بھی نہیں ہے

مکاں اپنا مکانِ لامکاں ہے
نشاں اُس کا کہیں ملتا نہیں ہے

خدا جانے کہاں وہ نازنیں ہے
نشاں اُس کا کہیں ملتا نہیں ہے

بقا کس کو ہے ضامنؔ سب ہیں فانی
سوا اُس کے رہا کوئی نہیں ہے

غزل مضطر

اے جانِ غم دشمن میں شوریدہ سری کیوں ہے
ہم تو ابھی زندہ ہیں یہ جامہ دری کیوں ہے

جب میں نے سیا دامن وحشت نے کہا تھم جا
آتی ہوں میں دیوانے یہ بخیہ گری کیوں ہے

آنکھوں کے دکھانے سے ظالم تجھے کیا حاصل
یوں ہی ترا بندہ ہوں جادو نظری کیوں ہے

تنہا نہیں رہنے کا ہرگز میں لحد میں بھی
تصویر کسی بت کی سینے پہ دھری کیوں ہے

مضطر کو جو رونے ہو کیا اس سے محبت تھی
اس سوگ کے میں صدقے آنکھوں میں تری کیوں ہے

غزل

ازل سے دونوں حسن و عشق میرے دل میں رہتے ہیں
بہم لیلیٰ و مجنوں ایک ہی محمل میں رہتے ہیں

مرے کانوں میں آہستہ کہا پیرِ طریقت نے
جسے تو ڈھونڈھتا ہے وہ تو تیرے دل میں رہتے ہیں

تعجب ہے جسے ہم نے کہیں دیکھا نہ پہچانا
وہ ہو کر صاحبِ پردہ ہر اک محفل میں رہتے ہیں

کروں کیونکر نہ سجدہ سر جھکا کر اپنے سینے کو
کہ سینے میں مرا دل ہے وہ میرے دل میں رہتے ہیں

عالیجناب حاجی سید وحید الدین احمد صاحب بیخود جانشین جناب داغ

وہ عاشق سے کیا دل ملا کر ملے
حیا سے بدن جو چرا کر ملے

خوشی سال بھر کی مٹا کر ملے
کہ وہ عید بھی کسمسا کر ملے

غزل جناب نیاز

دل چھینا نگاہیں چھپا کر چلے — کوئی پوچھے یہ جادو سا کیا کر چلے
مرے پہلو میں دم بھر کو بیٹھے تو کیا — دل و جان و جگر سب جلا کر چلے
مجھے چھوڑا تڑپتا ہوا خاک پر — مری جانب سے دامن بچا کر چلے
چاہے بولو نہ بولو تمہاری خوشی — ترے در پر یہ سائل دعا کر چلے
یہ خوشی ہے تری بھیک دے یا نہ دے — ترے در پہ بھکاری صدا کر چلے
ترا دامن نہ چھوڑیں گے روز جزا — تجھے محشر میں دولہا بنا کر چلے

اکبر الہ آبادی

کہوں کس سے قصۂ درد و غم، کوئی ہمنشیں ہے نہ یار ہے
جو انیس ہے تری یاد ہے، جو شفیق ہے دل زار ہے
تو ہزار کرتا لگاوٹیں، میں کبھی نہ آتا فریب میں
مجھے پہلے اس کی خبر نہ تھی، ترا دو ہی دن کا پیار ہے
یہ نوید اوروں کو جا سنا، ہم اسیر دام ہیں اے صبا
ہمیں کیا جو چمن ہے رنگ پہ، ہمیں کیا جو فصل بہار ہے
جسے درد چرخ میں ہو خوشی، تو ضرور ہے اسے رنج بھی
شب ہجر میں ہے جو درد سر، مئے وصل کا یہ خمار ہے
وہ نظر جو مجھ سے ملا گئے، تو یہ اور آفتیں ڈھا گئے
کہ حواس و ہوش و خرد ہے اب نہ شکیب ہے نہ قرار ہے
مجھے رحم آتا ہے دیکھ کر، ترا حال اکبر نوحہ گر
تجھے وہ بھی چاہے خدا کرے کہ جس کا تو عاشق زار ہے

غزل تاباںؔ

عشق کیا شے ہے کسی کامل سے پوچھا چاہیے
کسطرح جاتا ہے دِل بیدل سے پوچھا چاہیے

کیا تڑپنے میں مزہ ہے قتل ہو پیارے کے ہاتھ
اُس کی لذت کیا کسی بسمل سے پوچھا چاہیے

جس نے اُس کا زخم کھایا ہو اُسے معلوم ہو
تیغِ ابرو کی صفت گھائل سے پوچھا چاہیے

یار کے ملنے کی کوئی طرح آتی ہی نہیں
طرح ملنے کی کسی واصل سے پوچھا چاہیے

آہ و نالہ کی حقیقت دیکھتا ہوں سحر میں
کیا گزرتی ہوگی تاباںؔ دِل سے پوچھا چاہیے

تمام شد

علم مجلسی

یا
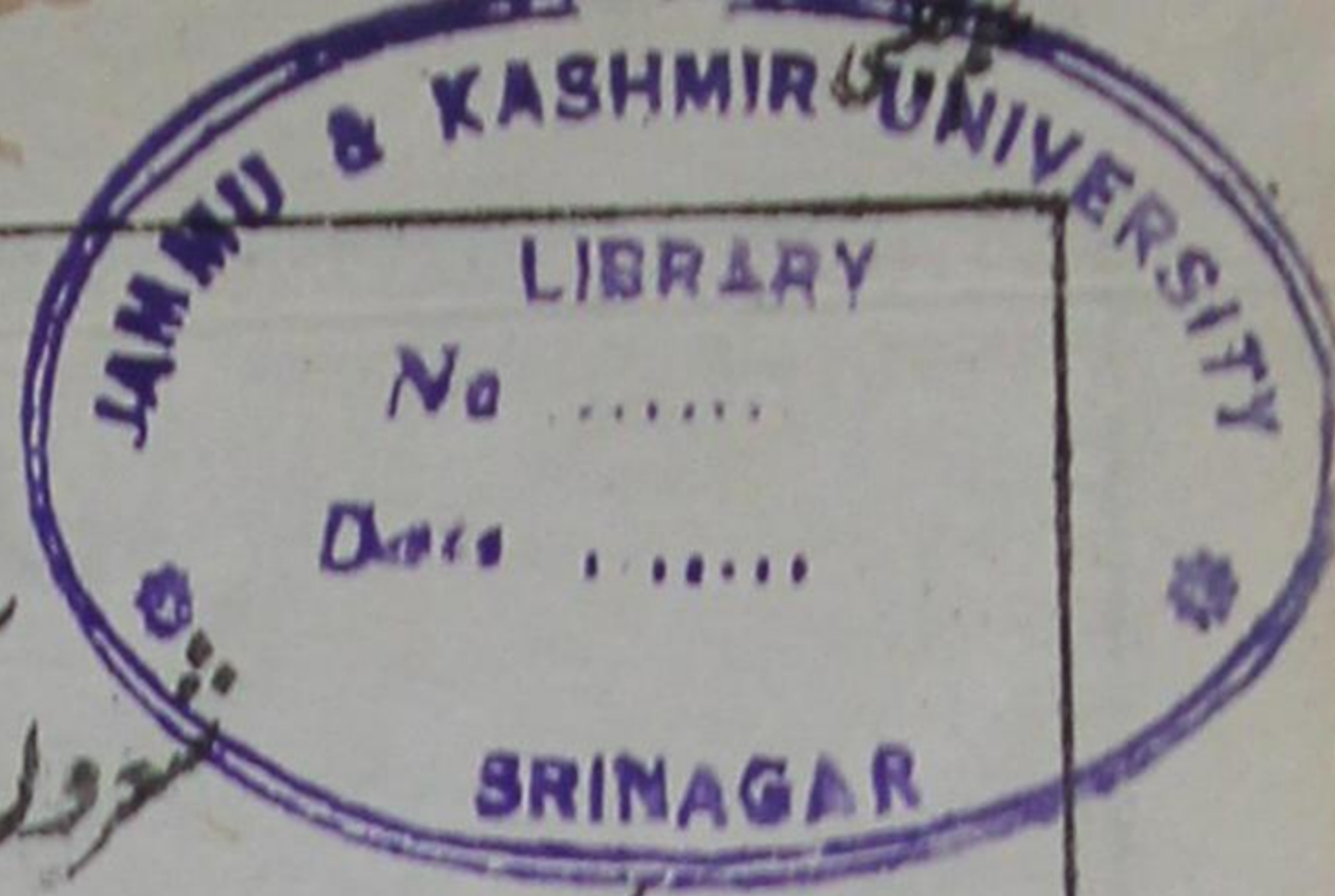
شعروں کی ڈکشنری

علم مجلسی کتاب کے اول تین حصوں میں تو شعروں کی ڈکشنری ہے جس میں "الف" سے لیکر "ی" تک دینی دنیاوی روحانی ۔ اخلاقی ۔ نیز ۔ ناصحانہ ۔ عاشقانہ و ظریفانہ ۔ غرض ہر قسم کے عنوان اور ان کے مطابق اشعار ملیں گے جو خط و کتابت میں تحریر و تقریر میں لکچر و وعظ میں روزانہ معمولی گفتگو میں بڑی خوبی سے استعمال ہو سکتے ہیں ۔ اور تحریر و تقریر کو پُر لطف ۔ دلنشیں اور مدلل و پُر تاثیر بنا دیتے ہیں ۔ چاہیے جس مضمون کے ہندرہ میں با موقع کھٹکے دار پھڑکتے ہوئے اشعار فہرست مضامین دیکھ کر چٹکی بجاتے میں نکال لیجیے ۔ قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم عہ سوم عہ

قطعات و رباعیات ۔ علم مجلسی کتاب کے چوتھے اور چھٹے حصوں میں بڑے بڑے نامور مشہور و باکمال شاعروں کے نہایت ہی دلچسپ قطعے ۔ رباعیاں اور عجیب و غریب چٹکلے دار معنی خیز نظمیں بڑی بڑی کوششوں سے مدتوں تلاش کر کے جمع کی گئی ہیں ۔ ان حصوں میں حقیقت و معرفت ۔ عبرت و نصیحت مذاق و ظرافت کے مضمون پہلو بہ پہلو سجے ہوئے ہیں ۔ جو قابل دید ہیں ۔ قیمت حصہ چہارم عہ ۔ حصہ ششم عہ

غزلیات ۔ علم مجلسی کے پانچویں اور ساتویں حصوں میں غزلیات کا مجموعہ ہے ۔ مگر وہ غزلیں ہیں جو ہزاروں لاکھوں غزلوں میں سے انتخاب کی گئی ہیں ۔ اور ان غزلوں میں سے بھی بہترین چوٹی کے اشعار لئے گئے ہیں ۔ بھرتی کے شعر چھوڑ دیئے گئے ہیں ۔ تاکہ جو کچھ بھی اس کتاب میں ہو دلچسپی سے خالی نہ ہو ۔

قیمت حصہ پنجم عہ ۔ حصہ ہفتم عہ ۔

ملنے کا پتہ

مجیبیہ وحیدیہ کتبخانہ کلاں محل دہلی